تحقیقی وتنقیدی مجلّہ

دریافت

جلد: 16 شمارہ: 01

شعبہ اردو زبان وادب

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

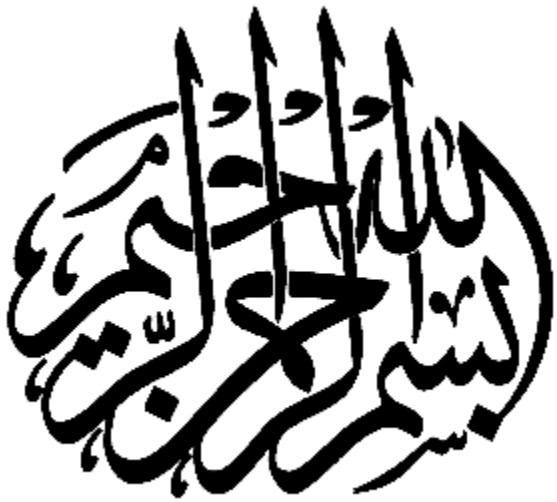
بسم الله الرحمن الرحيم

مقالہ نگاروں کے لیے ہدایات

۱۔ "دریافت" ایچ۔ای۔ سی (HEC) سے منظور شدہ "Y" کٹیگری کا حامل تحقیقی و تنقیدی مجلّہ ہے جس میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے غیر مطبوعہ مقالات ایچ۔ای۔ سی (HEC) کے طے کردہ اصول و ضوابط کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔

۲۔ تمام مقالات کا اشاعت سے قبل اندرون ملک اور بیرون ملک ماہرین سے "Double Blind Peer Review" ہوتا ہے جس میں دو سے تین ماہ لگ سکتے ہیں۔

۳۔ دریافت کی اشاعت سال میں دو دفعہ بالترتیب جون اور دسمبر میں ہوتی ہے۔

۴۔ "دریافت" کا اختصاص اردو زبان و ادب کے درج ذیل زمروں میں معیاری مقالات کی اشاعت ہے:

ا۔ تحقیق: متنی / موضوعی۔ ب۔ مباحث: علمی / تنقیدی۔

ج۔ مطالعہ ادب: اردو فکشن / شاعری۔ د۔ تنقید و تجزیہ: اردو فکشن / شاعری، اقبال شناسی وغیرہ

۵۔ تراجم اور تخلیقی تحریریں مثلاً غزل، نظم، افسانہ وغیرہ قطعاً ارسال نہ کی جائیں۔

۶۔ "دریافت" میں مقالہ بھیجنے کے بعد اس کے انتخاب یا معذرت کی اطلاع موصول ہونے تک مقالہ کہیں اور نہ بھیجا جائے۔

۷۔ "دریافت" کی ایچ۔ای۔ سی (HEC) میں طے شدہ درجہ بندی 'اردو' ہے۔ دیگر شعبہ جات کے اسکالرز مقالات نہ بھیجیں۔

۸۔ مقالہ اُردو زبان میں ہونا چاہیے۔ کسی دوسری زبان میں لکھا جانے والا مقالہ ناقابلِ قبول ہو گا۔

۹۔ مقالہ بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خیال رکھا جائے:

i۔ مقالہ صرف OJS (https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft) پر ارسال کیا جائے۔

ii۔ نمل ریسرچ پالیسی کے مطابق مقالے کی فیس -/13,000 روپے مقرر کی گئی ہے تفصیل کے لیے ویب گاہ ملاحظہ کیجیے۔

iii۔ مقالے کا عنوان، محقق کا نام اور عہدے کے متعلق تمام تفاصیل اُردو اور انگریزی کے درست ہجوں کے ساتھ درج کی جائیں۔

iv۔ مقالے کا ملخص (Abstract) اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تقریباً ۱۵۰-۲۰۰ الفاظ پر مشتمل ہو۔ نیز مقالے کے کلیدی الفاظ Keywords بھی انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھے جائیں۔

v۔ مقالے کی موصولی، مقالے کا قابلِ اشاعت ہونے یا نہ ہونے کی اطلاع صرف برقی پتا (E.Mail) کے ذریعے دی جائے گی۔ اس لیے مقالہ نگار اپنا مستند برقی پتا، اپنا مکمل پتا اور رابطہ نمبر بھی درج کریں۔

vi۔ مقالے کے ساتھ الگ صفحے پر حلف نامہ منسلک کیا جائے کہ یہ تحریر غیر مطبوعہ ہے، مسروقہ یا کاپی شدہ نہیں ہے۔

vii۔ کمپوزنگ Microsoft Word میں ہو۔ (فائل: A4، مارجن چاروں جانب ایک انچ)۔ متن کا فونٹ سائز ۱۳ رکھا جائے۔ مقالے میں ہندسوں کا اندراج اردو میں ہو۔ مقالے کے لیے صفحات کی تعداد کم از کم ۱۰ سے ۱۵ ہے۔

viii۔ مقالے کے آخر میں حوالہ جات اردو کے ساتھ ساتھ **Roman Script** میں بھی ضرور درج کیے جائیں۔ بصورت دیگر مقالہ قابل قبول نہیں ہو گا۔

ix۔ حوالہ جات میں ایم ایل اے (MLA) فارمیٹ کی پیروی کی جائے۔

x۔ مقالے میں کہیں بھی آرائشی خط، علامات یا اشارات استعمال نہ کیے جائیں۔

xi۔ مجوزہ شرائط پوری نہ ہونے کی صورت میں مقالہ رد کر دیا جائے گا۔

دریافت

جلد:16 شمارہ:01

ISSN Online: 2616-6038

ISSN Print:1814-2885

سرپرستِ اعلیٰ

میجر جنرل (ر) شاہد محمود کیانی، ہلال امتیاز (ملٹری)، ریکٹر

سرپرست

ڈاکٹر محمد زبیر اقبال، پرو ریکٹر، آر اینڈ ایس آئی ڈویژن

مدیر اعلیٰ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی، ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

مدیر

ڈاکٹر ظفر احمد

معاون مدیر

ڈاکٹر ابو بکر صدیق راٹھور

تحقیقی معاون

سدرہ طاہر

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

E-mail:daryaft@numl.edu.pk
Web(OJS): https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft

مجلسِ ادارت (بین الاقوامی)

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار

صدرِ شعبہ اردو زبان وادب چیئر، استنبول یونیورسٹی، استنبول، ترکیہ

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین

شعبہ اردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، انڈیا

پروفیسر ڈاکٹر آسمان بیلن اوزجان

صدرِ شعبہ اردو، انقرہ یونیورسٹی، انقرہ، ترکیہ

پروفیسر ڈاکٹر محمود الاسلام

شعبہ اردو، فیکلٹی آف آرٹس، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم

صدرِ شعبہ اردو، فیکلٹی آف ہیومینٹیز، الازہر یونیورسٹی (گرلز کیمپس)، قاہرہ، مصر

مجلسِ ادارت (ملکی)

پروفیسر ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

ڈین، فیکلٹی آف سوشل سائنسز اینڈ ہیومینٹیز، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

ڈائریکٹر، انسٹیٹیوٹ آف اردو لینگویج اینڈ لیٹریچر، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر تنظیم الفردوس

صدرِ شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی، کراچی، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ ترین

شعبہ اردو، بہاوالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، پاکستان

مجلسِ مشاورت (بین الاقوامی)

پروفیسر ڈاکٹر ہنس ورنر ویسلر

شعبہ لسانیات اور فلالوجی، اپسالا یونیورسٹی، اپسالا، سویڈن

پروفیسر ڈاکٹر شہاب الدین

شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین جینابڑے

سنٹر فار انڈین لینگویجز، سکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچرل سٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نیو دہلی، انڈیا

پروفیسر ڈاکٹر محمد محفوظ احمد

صدرِ شعبہ اردو، فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نیو دہلی، انڈیا

ڈاکٹر آرزو چفت سورین

شعبہ اردو، یونیورسٹی آف استنبول، استنبول، ترکیہ

مجلسِ مشاورت (ملکی)

پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود خٹک

چیئرمین، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف بلوچستان، کوئٹہ، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر ضیا الحسن

انسٹیٹیوٹ آف اردو لینگویج اینڈ لیٹریچر، اورینٹل کالج، یونیورسٹی آف پنجاب، لاہور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین

صدرِ شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، پشاور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر صائمہ ارم

چیئرپرسن، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر سہیل عباس

چیئرپرسن، شعبہ اردو، غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان، پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

دریافت جلد:16 شمارہ:01(جنوری تا جون 2024ء)
ناشر: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔ مطبع: نمل پرنٹنگ پریس، اسلام آباد
رابطہ: شعبہ اردو زبان و ادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ایچ/نائن، اسلام آباد
فون:10-9265100-051/2262:Ext ای میل: daryaft@numl.edu.pk
ویب سائٹ(OJS):https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft
قیمت فی شمارہ:600روپے۔ بیرون ملک:5 ڈالر(علاوہ ڈاک خرچ)

فہرست

اداریہ

چینی ادیب رؤشی کے افسانے "بیوی کی عارضی فروخت" اور احمد ندیم قاسمی کے افسانے "بیٹے بیٹیاں" کا تقابلی مطالعہ	پروفیسر کونگ جُولان	۱
ڈاکٹر عمران ظفر کی مزاحیہ شاعری میں سماجی رویوں پر طنز	ڈاکٹر علی بیات / عامر بشیر	۱۰
آزاد کشمیر کی اردو شاعری پر ادبی شخصیات کے اثرات: ایک مطالعہ	ڈاکٹر محمد یوسف / ڈاکٹر عنبرین خواجہ	۲۷
اقبالیات اور تصوف: بشیر احمد نحوی کی اقبالیاتی فکر کا تجزیہ	طالب حُسین ہاشمی / ڈاکٹر سید شیراز علی زیدی	۴۷
"ساسا" کے کرداروں پر میڈیائی پروپیگنڈا کے اثرات	ڈاکٹر محمد سہیل اقبال / ڈاکٹر طاہرہ غفور	۵۸
ناسٹلجیا کے تناظر میں ناول "آگے سمندر ہے" کا مطالعہ	ثقلین احمد خان / محمد برہان حسن	۶۵
"بہاؤ" کے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ	الماس اکمل	۷۴
پی ایچ ڈی کی سطح پر پاکستانی جامعات میں آپ بیتی پر محررہ مقالات کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ	ڈاکٹر رحمان سرور باجوہ	۸۵
لاطینی امریکی ادیبوں کے نوبیل خطبات میں متبادل شناخت کا کلامیہ	قمر عباس علوی	۱۰۴
انڈیکس		۱۲۳

اداریہ

بیسویں صدی کی برق رفتار سائنسی ترقی نے صحیح معنوں میں اس وسیع و عریض دنیا کو سمیٹ کر ایک گاؤں کی صورت محدود کر دیا ہے۔ شاید اسی لیے عصر حاضر میں شعور کی آنکھ کھولنے والے براہ راست بیکراں آسمانوں پر نظریں جمانے کی سعی کرتے ہیں۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ اس متاثر کن ترقی کی راہ میں حائل ایک بڑی رکاوٹ گزشتہ صدی کے نصف آخر میں دور ہوئی۔ ابلاغ کی محدودیت کا مسئلہ ترقی کے سفر میں ایک سنگ گراں کی طرح مزاحم رہا۔ انسان کو ارتقائی سفر کے ابتدائی دور میں ہی ابلاغ کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا اور اس کے تدارک کے لیے ہر دور میں کوشاں رہا۔ اس کے لیے بین الثقافتی مطالعے، غیر ملکی زبانوں کی تحصیل، سفارت کاری اور ترجمہ جیسے فنون اور شعبوں کا سہارا لیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک بڑی پیش رفت سکندریہ کے کتب خانے میں ہوئی جہاں یونانی عالموں نے شعبہ ترجمہ قائم کیا۔ قرون وسطی کے مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں بغداد میں 'بیت الحکمۃ' کی بنیاد رکھ کر ترقی کے اس سفر کو سرعت سے طے کرنے کی کوشش کی۔ یورپ کی نشاۃ الثانیہ کے بعد مستشرقین نے تقابلی لسانیاتی مطالعات کی بنا ڈال کر گویا عصری تقاضوں کے عین مطابق تحقیقات کیں۔ تاہم بیسویں صدی میں کمپیوٹر اور اکیسویں صدی میں مشینی ترجمہ کاری اور مصنوعی ذہانت کی ترقی کے سبب ابلاغ کی راہ میں حائل یہ دیوار بالآخر زمیں بوس ہو گئی۔ جدید ذرائع ابلاغ کی ترقی نے اب حقیقی معنوں میں اس دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔

دریافت کا خصوصی اختصاص رہا ہے کہ بین الثقافتی اور عالمی ادبیات کے مطالعات کی اہمیت کے پیش نظر اس جانب خصوصی توجہ مرکوز رکھی جائے۔ زیر نظر شمارے میں بھی ایسے مقالات شامل ہیں جو کہ اردو زبان و ادب کے افق کی وسعت میں اضافے اور اس کی ثروت مندی بڑھانے میں اہم کردار ادا کریں گے۔

دریافت کا زیر نظر شمارہ (جلد: 16 شمارہ: 01) عام قارئین خصوصاً اردو زبان و ادب کی تحقیق و تنقید میں دلچسپی رکھنے والے ریسرچ اسکالرز اور اساتذہ کے لیے مرتب کیا گیا ہے، جس میں زبان و ادب کے بین الثقافتی و سماجی زاویوں کو اہمیت دی گئی ہے۔ ہم ان تمام مقالہ نگاروں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے معیاری مقالات لکھ کر اس مجلّے میں شائع ہونے کے لیے فراہم کیے۔

مدیران

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 15th Feb, 2024 | Accepted: 16th June, 2024 | Available Online: 30th June, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i01.393

چینی ادیب روؤشی کے افسانے "بیوی کی عارضی فروخت" اور احمد ندیم قاسمی کے افسانے "بیٹے بیٹیاں" کا تقابلی مطالعہ

A Comparative Study of the Short stories by Chinese Writer Rou Shi "A Slave Mother" and Ahmed Nadeem Qasmi "Sons & Daughters"

PROFESSOR KONG JULAN (Sitara-e-Quaid-e-Azam), (Sitara-e-Imtiaz)
School of Foreign Languages, Peking University, Beijing, China
(kongjl@pku.edu.cn)

ABSTRACT By comparing Rou Shi's and Ahmad Nadeem Qasmi's short stories, it is surprising to find that these two well-known authors, though living in different countries, have created works with very similar meanings. In revealing sufferings and miseries of women of the underclass, they have uncovered the common social problems brought about by poverty, ignorance, and outmoded conventions and customs. In the semi-feudalist society, women from both countries are all in a very humble position: they are deprived of their own social position, thus becoming lambs to be slaughtered, belongings of their husbands, and victims of poverty and backwardness. In their works, both authors unveiled the miserable and inhumane conditions of women, demonstrated the tragic life of working women of that time, condemned tortures and torments brought to women by the unfair social system, and offered their deep sympathy to poor peasants, especially toiling women. This study underscores the enduring relevance of literature in exposing and critiquing societal inequities, offering poignant insights into the shared struggles of women navigating oppressive systems across different national contexts.

Keywords China, Pakistan, Women, Gender bias, Stereotypical rituals, Discrimination.

"بیوی کی عارضی فروخت" اور "بیٹے بیٹیاں" بالترتیب چینی افسانہ نگار روؤشی اور پاکستانی افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے افسانے ہیں۔ ان افسانوں کی پڑھت کے بعد ایک حیران کن بات کی دریافت ہوتی ہے حالانکہ دونوں مصنف مختلف ملکوں، ثقافتوں میں آباد تھے اور دونوں کا سماجی، تہذیبی پس منظر بھی مختلف تھا لیکن ان کے افسانوں کا موضوع اور مرکزی خیال تقریباً ایک جیسا ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں نچلے طبقوں کی غریب عورتیں کتنی بدنصیب تھیں۔ ان کی زندگی کتنی دکھ بھری اور مصیبت زدہ تھی، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی دیوتا کے آگے قربان کیے جانے والے جانور ہیں۔ اطاعت گزار اور تابع فرمان اس قدر کہ پہلے اپنے والدین اور بعد میں اپنے مجازی خداؤں کے احکام کی منتظر رہتی ہیں۔ ان کی اپنی کوئی حیثیت تھی اور نہ ہی انھیں کوئی حق حاصل تھا کہ زندگی کے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ کر پاتیں۔ وہ دراصل غربت، جہالت، دقیانوسی خیالات اور انصاف سے عاری سماجی نظام کے ہاتھوں اپنی آرزوؤں اور

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

خواہشات کو قربان ہوتے ہوئے دیکھتی رہتی تھیں۔ دونوں کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دیہات چاہے چین کے ہوں یا پاکستان کے، طبقاتی استحصال بہت زیادہ تھا۔ جاگیر دارانہ معاشرے کی منافقت، ظلم وستم اور وحشت ہر سو پھیلی رہتی تھی۔ دونوں جانب کے دیہات شدید طبقاتی تضادات کا شکار نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں میں دراصل یہ حقیقت بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ معاشرے کے سب سے نچلے طبقے کی دیہاتی عورتوں کے ذہن اور شخصیت ایک بے رحم پامالی کی شکار ہیں۔ دونوں افسانوں میں دیہات کے پسماندہ اور غریب طبقے خصوصاً عورتوں کو درپیش مسائل کی نہایت باریک بینی سے تصویر کشی کی گئی ہے۔ نیز ایک غیر انسانی ماحول میں غربت اور بدحالی کے ہاتھوں کسانوں اور دیگر محنت کش اکثریت، خاص طور پر عورتوں کے شب وروز کی عکاسی نہایت فن کاری کے ساتھ کی گئی ہے۔

رؤشی کا افسانہ "بیوی کی عارضی فروخت" ۱۹۳۰ء میں منظر عام پر آیا۔ رؤشی بیسویں صدی کے نصف اول میں اہم مصنف اور ایک ایسے انقلابی تھے جو سرعام رجعت پسند حکومت کے خلاف آواز بلند کرتے تھے۔ اسی جرم کی پاداش میں رجعت پسندوں نے اس آواز کو ۱۹۳۱ء کو سزائے موت دے کر خاموش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اپنی مختصر زندگی جو کہ فقط ۲۸ برسوں پر مشتمل تھی میں انھوں نے چینی ادب میں جو تصانیف تخلیق کیں، ان کی اہمیت ہر گزرتے دن کے ساتھ دوچند ہو رہی ہے۔ بعد میں جب یہاں کے انقلابیوں کو کامیابی ملی اور جمہوریہ چین میں ترقی وخوشحالی کی نئی تاریخ رقم کرنے کی ابتدا ہوئی تب دورِ جدوجہد کے سارے اہم کرداروں کو یاد کیا گیا۔ ان کی زندگی اور کارہائے نمایاں کو خاطر خواہ اجاگر کیا گیا۔ رؤشی کی کہانیوں اور شاعری کو بھی اب چینی ادب میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ "بیوی کی عارضی فروخت" کوئی نوے سال پہلے شائع ہونے والا افسانہ ہے، لیکن اب اسے نہ صرف چین میں شہرت دوام حاصل ہے، بلکہ دنیا کی مختلف اہم زبانوں میں ترجمہ ہو کر عالمی کلاسیک کے مرتبے پر فائز ہو چکا ہے۔ یہ افسانہ پہلے 'غلام ماں' کے عنوان سے طبع ہوا تھا البتہ اشاعت کے بعد 'بیوی کی عارضی فروخت' کے نام سے اسٹیج پر پیش کیا گیا اور اس کے بعد اسی عنوان سے اس پر فلم بنائی گئی۔

اس افسانے کا پلاٹ کچھ یوں ہے کہ گزشتہ صدی کے تیسرے عشرے میں چین کے ایک گاؤں میں ایک محنتی، ذہین اور باہمت عورت رہتی تھی۔ کہانی میں اس کا کوئی نام نہیں ہے۔ گاؤں والے اسے اس کے بیٹے کے نام کی نسبت سے چھوین باؤ کی ماں کہہ کر پکارتے تھے۔ شادی کے بعد اس کے ہاں پہلی اولاد ایک بیٹی ہوئی۔ جس کے پیدا ہوتے ہی اس کے شوہر نے نوزائیدہ کو اُبلتے ہوئے پانی میں ڈبو کر مار ڈالا۔ دوسرا بچہ بیٹا تھا اس لیے بچ گیا۔ جب یہ بچہ پانچ سال کا ہوا تب اس کے شوہر کی مالی حالت جو ایک عام کسان اور چمڑے بیچنے والا تھا، مزید خراب ہوئی۔ افسانے میں اس کی معاشی حالت کا بیان کچھ اس طور ہوا ہے۔

> "اس کی معاشی حالات بہت مشکل صورت حال سے دوچار تھی اور سال بہ سال اس کا قرض بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر وہ افیون کھانے، شراب پینے اور جوا کھیلنے کا عادی ہو گیا۔ ساتھ ہی اس کا مزاج بھی مزید درشت اور گستاخ ہو گیا۔۔۔ غربت سے اس کے سارے جسم کا رنگ پیلا ہو گیا اور وہ یرقان کی بیماری کا شکار بھی رہا"(۱)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ایک دن اس نے چھوین باؤ کی ماں یعنی اپنی بیوی سے کہا کہ

"اب میرے پاس کوئی چارہ نہیں ہے اور گھر کا دیگچہ تک بھی بیچ دیا۔ اب تم ہی سے زندہ رہنے کا کوئی طریقہ ڈھونڈ رہا تھا۔۔۔ میں نے تمہیں تین سال کے لیے عارضی طور پر فروخت کر دیا ہے۔"(۲)

قریبی گاؤں میں ایک امیر آدمی کی بیوی نظام تولید میں خرابی کی وجہ سے اولاد جیسی نعمت سے محروم تھی۔ امیر شخص اپنی وراثت کا سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا۔ آخر کار اسے یہ ترکیب سوجھی کہ کسی ایسی عورت کی مدد سے اپنے لیے بیٹا اور وارث حاصل کرے جس کی اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت ثابت شدہ ہو، نیز وہ یہ کام پیسوں کے عوض کرنے کو بھی تیار ہو۔ اس کام کے لیے چھوین باؤ کی ماں کا انتخاب کیا گیا کیونکہ وہ کامیابی سے دو بچے جن چکی تھیں۔ اس سے اہم بات یہ کہ اس کے شوہر کی ناگفتہ بہ مالی حالت کی وجہ سے سہولت سے سارے امور انجام پانے کی امید بھی تھی۔ معاہدے کی شرطِ اولین یہ تھی کہ چھوین باؤ کی ماں تین یا پانچ سال میں اس امیر شخص کے لیے ایک بیٹا جنے گی اور اس کے بدلے امیر اس کے شوہر کو چاندی کے سو سکے دے گا۔ یوں چھوین باؤ کی ماں امیر کے گھر آئیں اور ایک ملازمہ کی حیثیت سے امیر کے گھر میں مشقت کا کام کرنے لگیں۔ اس کے ساتھ وہ اس امیر شخص کی بیوی کا ظلم بھی برداشت کرتی رہیں۔ دوسرے سال میں چھوین باؤ کی ماں نے امیر کے لیے ایک بیٹا جنم دیا۔ جب بچہ ڈھائی سال کا ہوا، حالانکہ چھوین باؤ کی ماں اپنے پیارے بیٹے کے لیے ایک اور سال ٹھہرنا چاہتی تھیں، تب امیر آدمی کی سنگ دل بیوی نے اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ چھوین باؤ کی ماں کو اپنا پیارا بچہ چھوڑ کر واپس اپنے گھر لوٹنا پڑا۔ بے چاری چھوین باؤ کی ماں نے پہلے ایک بیٹے کی جدائی برداشت کی تھی اب دوسرے کو کھونے کی تکلیف بھی اس کے نصیب میں آئی۔ وہ اپنے دوسرے بیٹے کی یاد میں روتے ہوئے اپنے اصلی گھر واپس آئیں۔ جب گھر پہنچیں تو دیکھا کہ اس کا پہلا بیٹا پھٹے پرانے اور گندے لباس میں تھا۔ اس کا قد کاٹھ بھی ویسا تھا جیسے پانچ سال پہلے تھا، حالانکہ اس کی عمر اب نو برس تھی۔ مستزاد یہ کہ اس کے شوہر کی حالت پہلے سے بھی خراب تھی۔

اس کہانی نے پرانے معاشرتی نظام کی دقیانوسی رواج پر تنقید کی اور طبقاتی استحصال، جاگیردارانہ آداب کی منافقت، ظلم اور مصیبت میں پھنسی ہوئی مامتا کی تکالیف کو بے نقاب کر دیا۔ محنت کش عورتوں کی دکھ بھری قسمت پر گہری ہمدردی کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی رؤشی نے کہانی میں ''غریبوں اور خواتین کے خلاف امتیازی سلوک'' کا مسئلہ اٹھایا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانے 'بیٹے بیٹیاں' میں پاکستانی پنجاب کی ایک ایسی روایتی حقیقت کو قلم بند کیا گیا ہے، جسے عرف عام میں 'وٹے سٹے' کی شادی کہا جاتا ہے۔ غریب رنڈوا ہادی اپنی جوان بیٹی کے رشتے کے لیے اپنے ہم عمر دوست بیگو کے ہاں جاتا ہے، جس کا ایک جوان بیٹا تھا۔ جب ہادی نے بیگو کے سامنے اپنی عرضداشت پیش کی تو بیگو نے جواب دیا:

"ایک جوان بیٹے کا باپ ہوں، تو میری ایک جوان بیٹی بھی تو ہے۔ کوئی بیٹی کا پوچھنے آئے تو بیٹے کا رشتہ دے کے جائے، کسی نے بیٹے کی بات کی تو بیٹی کے رشتے کی شرط لگا دوں گا، ایک لے جاؤ، ایک دے جاؤ، حساب برابر۔"(۳)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

چونکہ رنڈوے کمہار ہادی کا بیٹا ابھی شادی کی عمر کو نہیں پہنچا تھا، تو کچھ توقف کے بعد بیگو نے اس کا حل کچھ یوں پیش کیا کہ "دینو، تمہارا داماد بن جائے، اور تم میرے"(۴)

ہادی نے مجبوراً جوان بیٹی کی شادی کے لیے اپنے دوست کی نوجوان لڑکی شرفی سے شادی کرلی۔ پانچ سال کے بعد کمہار ہادی کا بیٹا مراد جوان ہوا تو گاؤں سے شکایات آنی شروع ہو گئیں کہ اس کے لچھن اچھے نہیں۔ تنگ آکر ہادی اور شرفی دونوں نے آس پاس کے دیہات میں کمہاروں کے گھروں کے چکر لگانے شروع کر دیا۔ تاہم کوئی مناسب لڑکی نہیں ملی، کیونکہ "قریب قریب سب کمہار، بیٹیوں کے ساتھ بیٹے لیے بیٹھے تھے۔"(۵) آخر میں ایک دُور کے رشتہ دار نادر کمہار کے ہاں اس کی بیٹی کا رشتہ مانگنے چلے جاتے ہیں۔ مگر نادر یہ شرط رکھ دیتا ہے کہ:

> "مجھے بھی تو دنیا میں زندہ رہنا ہے۔ بیٹی اگر تمہارے پاس چلی گئی، تو میں اکیلا کیا کروں گا، کیسے جیوں گا، تو یوں کرو، کہیں سے کسی بیوہ کا انتظام کر دو، میں اس کو اپنے گھر میں ڈال لوں گا، تم میری بیٹی کو اپنے ہاں لے جانا۔ گندی بات ہے پر سچی بات ہے۔ تم دونوں جب کوئی انتظام کر لوگے تو میں بیٹی کا ہاتھ پکڑوں گا اور تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔"(۶)

ہادی اور شرفی واپس آکر سوچنے لگے اور اتنے میں صوبیدار نے ہادی کو بلا کر کہا کہ 'اگر آج کے بعد مراد نے کوئی ایسی حرکت کی تو اس سے برا کوئی نہیں ہو گا۔۔۔ ورنہ یہ قتل ہو گا یا جیل میں جائے گا۔'(۷) ان حالات میں ہادی ایک تلخ فیصلہ کر چکا تھا، یعنی اپنے بیٹے کی شادی کے لیے اپنا گھر برباد کرنے کا فیصلہ۔ اس بیچارے کمہار ہادی کو اپنے بیٹے کی فوری شادی کے لیے اپنی بیوی کو طلاق دینا پڑی، تاکہ نادر کے مطالبے کے مطابق رشتے کی شرط پوری کر سکے اور ساتھ ہی وہ اپنی بیٹی اس کے بیٹے کے نکاح میں دے دے اور شرفی کو نادر سے شادی کرنا تھی۔ یہاں ایک افسوس ناک اور دل شکستہ کہانی پیش کی گئی ہے۔ پنجاب کے دیہات میں غریب کمہاروں کی زندگی کی محرومیوں اور مجبوریوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ معاشرے کی اس مکروہ روایت کے منفی اثرات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

"بیوی کی عارضی فروخت" میں چھوین باؤ کی ماں اور "بیٹے بیٹیاں" میں شرفی دونوں کو یا تو عارضی طور پر فروخت کر دیا گیا یا طلاق دے کر دوسری شادی کے لیے مجبور کیا گیا۔ ان کے نصیب کس قدر ملتے جلتے ہیں۔ مصیبت زدہ، اور قربانی کے جانوروں کی مانند۔ والد اور شوہر کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ ان کی اپنی کوئی حیثیت ہے اور نہ ہی کوئی حق حاصل ہے کہ اپنے بارے میں کسی قسم کا کوئی فیصلہ کریں۔ غربت، جاہلیت، دقیانوسی اور پدری نظام کی ناانصافیوں کے ہاتھوں قربان ہونے پر مجبور ہیں۔

دونوں کہانیوں میں والد یا شوہر نے جو کچھ کیا، وہ سب غربت اور دقیانوسی روایات کا نتیجہ ہے۔ 'بیوی کی عارضی فروخت' میں شوہر ایک کسان اور چمڑا بیچنے والا ہے۔ اس کی زندگی اپنا گھر سنبھالنے کی کوشش میں صرف ہو رہی ہے۔ تاہم افراتفری کے اس زمانے میں عام لوگوں کے شب و روز تباہی سے دوچار ہیں۔ ایک سرا پکڑتے ہیں تو دوسرا کھل جاتا ہے۔ گاؤں میں افیون کھانے، جوا کھیلنے اور شراب نوشی جیسی خرافات دوبارہ سر اٹھا رہی ہیں۔ عام لوگ سمجھتے ہیں کہ ان مسائل اور دکھوں کا حل شراب پینا ہے۔ کیونکہ شراب پینے اور افیون

کھانے سے وقتی طور پر لوگ اپنے مسائل اور دکھ بھول جاتا ہے۔ جوا کھیلنا بھی ایک برا مشغلہ ہے۔ جوے کی لت اس وقت پڑتی ہے جب کسی کو اپنے معاشی مسائل کا کوئی جائز حل نہ سوجھے یا وہ جائز طریقے سے انھیں حل کرنے کی بجائے مختصر اور فوری حل کی خواہش کریں۔ دراصل جوا کھیلنا اپنے آپ کو تباہ کرنے کے جیسا ہے۔ کہانی میں ایک ایسے ہی غریب کسان کی کہانی بیان ہوئی ہے جو یکے بعد دیگرے ایسے غلط فیصلے کرتا ہے جو اس کے گھر اور گھر والوں کو اپنے ہاتھوں سے تباہی سے دوچار کر دیتا ہے۔

"بیٹے اور بیٹیاں" میں شوہر اور باپ ہادی جو پہلے سے ہی غربت کی چکی میں پس رہا ہے، اسے اپنے بچوں کو آباد کرنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔ اس کے لیے قربانیاں دینی پڑیں۔ پہلے مجبوراً اپنی جوان بیٹی کو ایک بوڑھے کے ساتھ بیاہنا پڑا اور بعد میں اپنی بیوی کو طلاق دینا پڑی۔ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دل سے اس فیصلے سے خوش نہیں۔ لیکن صورت حال ایسی دکھائی گئی ہے کہ اسے ایک گھر آباد کرنے کے لیے دوسرا گھر برباد کرنا پڑا۔ بظاہر کمہار ہادی داماد بنا، لیکن حقیقت میں وہ بھی ایک مکروہ اور ہیجان زدہ سماجی آداب اور دقیانوسی روایات کے ہاتھوں شکار ہوا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کہانیوں میں کس نوع کی یکسانیت پائی جاتی ہے؟ اس ضمن میں پہلا نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ دونوں کہانیوں کا سیاسی اور معاشرتی پس منظر ایک جیسا ہے۔ دونوں کہانیوں کا پس منظر بیسویں صدی کے تیسرے اور پانچویں عشرے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس زمانے میں چین اور تقسیم سے قبل کے ہندوستان میں اپنی قومی خود مختاری اور آزادی کی جدوجہد زوروں پر تھی۔ دونوں خطے افراتفری کا شکار تھے۔ عوام آگ اور خون جیسی مصیبتوں میں مبتلا تھے۔ کبھی قحط پڑتا تو آبادی کے ایک بڑے حصے کو کھانے پینے کے لالے پڑ جاتے تھے۔ لوگ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ غریب لوگوں کو زندہ رہنے کے لیے کبھی اپنے بچوں کو بھی بیچنا پڑ جاتا تھا تاکہ بچے قحط کے بے رحم ہاتھوں نہ مر جائیں اور خود کو زندہ رکھنے کے لیے کچھ پیسے بھی مل سکیں۔ چین کے پسماندہ علاقوں میں بھی 'وٹے سٹے' کی شادیاں ہوتی تھیں۔ پاکستان کے برعکس چین میں یہ رواج چلا آرہا ہے کہ جہیز دینا لڑکی والوں کی ذمہ داری نہیں تھی۔ لڑکے والوں کے لیے خاص طور پر قدیم چین کے غریب گھرانوں کے لڑکوں کے لیے بیوی ڈھونڈ کر لانا بہت مشکل کام تھا۔ کیونکہ لڑکے والوں کو لڑکی کے والدین کو بڑی تعداد میں پیسے یعنی جہیز دینے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس دور میں جو گھر مالی اعتبار سے کمزور تھے، ایسے گھروں کے لڑکے عموماً کنوارے رہ جاتے تھے۔ کبھی کبھی غریب گھروں کے بیٹوں کی شادی یوں ہو جاتی تھی کہ اتفاق سے اسی گھر میں بیٹیاں بھی ہوتی تھیں۔ اسی طرح غریب گھروں کے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی بغیر جہیز کے ہو جاتی تھی۔ یہ بالکل احمد ندیم قاسمی کے افسانے 'بیٹے بیٹیاں' سے مشابہ ہے اور یہ 'وٹے سٹے' کی شادی بھی کہلا سکتی ہے۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک برصغیر برطانیہ کی نوآبادی رہا۔ جنوبی ایشیا کی عوام کو کئی طبقوں کے ظلم و ستم برداشت کرنا پڑتے تھے، جس میں سامراج برطانیہ کی نوآبادیت کا جبر، جاگیرداریت کے ہاتھوں استحصال اور ذات پات کے نظام کی پابندیاں وغیرہ شامل تھیں۔ یہاں کی عوام کی زندگی اُس زمانے کی چینی عوام سے زیادہ بہتر بھی نہیں تھی۔ یہ بھی غربت کا شکار رہے اور اس پر مستزاد یہ کہ بیٹیوں کی شادی کے لیے جہیز کی لازمی شرط بھی پوری کرنا پڑتا تھا۔ اگر بیٹیوں کے والدین جہیز نہیں دیتے یا دینے کے قابل نہیں ہوتے، دونوں صورتوں میں بیچاری بیٹی کو سسرال میں ظلم و ستم کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس لیے جس کے گھر میں بیٹی پیدا ہوتی تھی تو والدین کو اسی دن

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

سے جہیز کی تیاری شروع کرنا پڑتی تھی۔ جب والدین جہیز دینے کے قابل نہیں رہتے تھے انہیں دوسرا طریقہ سوچنا پڑتا تھا، یعنی 'وٹے سٹے' کی شادی کی جائے۔ ضرورت پڑنے پر اپنی بیوی کو بھی طلاق دینا پڑتا تھا۔ برصغیر کے لوگوں کے لیے ذات بات کی پابندی بھی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے، کیونکہ شادی عموماً اپنی ذات میں ہی ہو سکتی ہے۔

"بیوی کی عارضی فروخت" ایک اتفاقی واقعہ نہیں ہے بلکہ جنوبی چین کے زوجانگ دیہاتوں میں رائج بیوی کی عارضی فروخت کی رسم پر مبنی افسانہ ہے۔ یہاں بیوی کی عارضی فروخت کا رواج برسوں سے چلا آرہا تھا۔ امیر کے گھر میں اگر بیٹا پیدا نہیں ہوتا تھا تب امیر کسی غریب گھرانے کی ایسی عورت کی خدمات حاصل کرتے تھے جو پہلے سے شادی شدہ ہو اور ایک یا دو بیٹے پیدا کر چکی ہو۔ غریب گھرانوں کی ایسی عورتوں کو امیر چند سال اپنے گھر میں رکھتے تھے، جب تک بیٹا پیدا ہوتا تھا۔ اس کے بدلے میں غریب گھرانوں کو معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ رؤشی نے اپنے آنکھوں سے جب یہ سب دیکھا تو ایک حساس دل و دماغ رکھنے والے افسانہ نگار و شاعر کو دکھ ہوا۔ انھوں نے اس قبیح رسم کو افسانے کی صورت میں بیان کر کے اس غیر انسانی اور دقیانوسی رواج کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی۔

بیوی کو عارضی فروخت کرنے کی قدیم دقیانوسی رسم چینی معاشرے میں موجود تھی، جس میں جیتے جاگتے انسان کو ایک بے جان چیز کے برابر حیثیت دے کر عارضی طور پر فروخت کیا جاتا تھا۔ یہ رسم اس لیے بھی چلتی رہی کہ کسانوں کی مالی حالت سنگین تھی اور وہ غربت کا شکار اور مجبور تھے۔ غرض کہ جاگیر دارانہ نظام میں محنت کش نہ صرف معاشی طور پر استحصال اور ظلم ستم کا شکار تھے بلکہ معیشت سے بڑھ کر ایک شدید قسم کا ذہنی ظلم و ستم بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ اس ظلم و جبر کے ہاتھوں مقدس رشتے جو ماں کی ممتا کے روپ میں تھی وہ بھی محفوظ نہ تھی۔ اس پاک اور بے لوث جذبے پر بھی معاشرے کے دقیانوسی تصورات کے چلتے نہایت ضرب کاری لگتی رہی۔

"بیٹے اور بیٹیاں" وٹے سٹے کی رسم پر مبنی کہانی ہے۔ اس افسانے میں پنجاب کی ایک ایسی روایتی حقیقت کو قلمبند کیا گیا ہے جسے عرف عام میں 'وٹے سٹے کی شادی' کہا جاتا ہے۔ یہ رواج عام طور پر پورے خطے میں خصوصاً یہاں کے دیہات میں عام ہے۔ دیہات میں بھی معاشرے کے نچلے طبقوں میں اس کا زیادہ چلن پایا جاتا ہے۔ یہ افسانہ دیہات میں مٹی کے برتن بنانے والے کمہاروں سے متعلق ہے۔ یہاں کی زندگی میں نچلی ذاتوں اور غربت کے مابین چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اس معاشرے میں یہ دستور رہا ہے کہ وہ ہمیشہ دولت والوں کا ساتھ دیتا ہے، غربت کے ہاتھوں عزت اور آرزوں کا صرف خون ہوتا رہا ہے۔ ہادی کمہار اپنی بیٹی نازو کا رشتہ بیگو کمہار کے بیٹے دینو سے کرتا ہے اور وٹے سٹے کے اصول کے تحت بیگو کی بیٹی شرفی کی شادی ہادی کمہار ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بیگو اور ہادی دونوں رنڈوے ہیں۔

> "افسانہ نگار نے اس معاشرے کی اس مکروہ روایت کے منفی اثرات کو اجاگر کیا ہے، جس میں شادی کے ایسے طریقے اگر کچھ گھر آباد کرتے ہیں تو انہی کی وجہ سے برباد بھی ہوتے ہیں، اس رواج میں عورت کے ساتھ بالخصوص ناانصافی ہو جاتی ہے۔ اس رواج کو پورا کرتے ہوئے مناسب جوڑے یا مناسب عمروں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ بس وٹے سٹے کی ریت پوری کرنی ہوتی

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ہے۔ دیہات میں معاشرتی اقدار کا یہ خاص پہلو ہے، جس کو ہر زمانے میں برا سمجھا گیا، مگر ان منفی اقتدار کو تبدیل کرنا یا ان سے مصلحانہ برتاؤ کی روایت کم ہی نظر آتی ہے۔ بیٹی کی عزت سب کو عزیز ہوتی ہے، مگر کمی ذات کی اکثر بیٹیوں کی عزت بڑے زمینداروں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔"(۷)

ان افسانوں میں ایک اہم اشتراک یہ بھی ملتا ہے کہ دونوں میں خواتین کے خلاف معاشروں کا امتیازی سلوک دکھایا گیا ہے۔ یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورتوں کی سماجی حیثیت مردوں کی نسبت بہت کم ہے۔ عورتوں کو یا تو عارضی طور پر فروخت کر دیا جاتا ہے یا طلاق دے کر کسی دوسرے مرد کے نکاح میں دے دی جاتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کی سماجی حیثیت کم تر ہے۔ انھیں مردوں کی نسبت دوسرے یا تیسرے درجے کی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۴۹ء سے پہلے چین کی عورتوں کی سماجی حیثیت پستی کا شکار تھی، خاص طور پر دیہات میں یہ ظلم عروج پر تھا۔ شادی سے پہلے بیٹیاں گھر میں والدین کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ انہیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کو نہ صرف یہاں ایک بے کار اور فضول عمل سمجھا جاتا تھا بلکہ لڑکیوں کو پڑھنے کا موقع دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آزادی سے زندگی گزارنا اور اور خود مختار و خود کفیل ہونے کے لیے گھر سے باہر نکل کر نوکری کرنے کا تو تصور کرنا بھی گناہ تھا۔ اٹھارہ سال تک شادی کر دی جاتی تھی، پھر سسرال جا کر اس گھر کا فرد بن جاتی تھی۔ شوہر اور سسرالیوں کی خدمت کرتی تھی۔ یہاں بھی اس کی حیثیت فقط ایک کارکن کی سی ہوتی تھی جو دن رات گھر کے کاموں میں جتی رہتی۔ اردو کے ایک اور مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی نے بھی اپنے افسانوں 'گرہن' اور 'ہولی' میں یہاں کی عورت کی زندگی کی تصویر کشی نہایت فنکاری سے کی ہے۔ یعنی وہ اولاد جنم دیتی ہے پھر انھیں پالتی ہے، کھانے پینے کا انتظام سنبھالتی ہے، سارا دن کام ہی کام کرتی ہے۔

برصغیر میں عورتوں کی سماجی حیثیت پرانے زمانے کی چینی عورتوں سے ذات پات اور معاشرتی طبقوں کی تقسیم کی وجہ سے زیادہ کم تر تھی۔ اکثر فلموں یا افسانوں میں دکھایا جاتا ہے کہ بے چاری کم عمر لڑکیوں کی شادی ایک بڑی عمر کے آدمی کے ساتھ ہوئی۔ ان کی زندگی کا واحد نصب العین ہی گھر کا کام کرنا یا بچے پیدا کرنا ہے۔ اس کے سوان کا کوئی حق یا خواہش ہو ہی نہیں سکتی۔ 'بیٹے بیٹیاں' میں بیٹے کی شادی کے لیے بیٹیوں کی قسمت قربان کر دی جاتی ہے۔ کیونکہ بیٹیوں کی شادی میں جہیز لازمی دینا ہے لہذا جہیز کے بغیر شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ برصغیر میں بے شمار لڑکیاں جہیز کی کمی کی وجہ سے ساس اور شوہروں کے ظلم و ستم کا شکار ہونے سے نہیں بچتیں۔ یہاں تک کہ اس بیچارے کمہار کو بیٹے کی فوری شادی کے لیے اپنی بیوی کو طلاق دینا پڑی۔

درج بالا تجزیے اور تقابل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں چاہے برصغیر میں، چاہے چین میں عورتوں کی سماجی حیثیت کم تر تھی۔ ان کے خلاف امتیازی سلوک روا رکھنا عام تھا۔ انھیں اپنے حقوق سے دُور رکھا جاتا تھا۔ بلکہ انھیں اکثر بد سلوکی، نفرت اور حقارت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اپنے خلاف ہونے والے مظالم پر لب کشائی اور اپنے حقوق کی حفاظت سے بھی محروم رکھا جاتا تھا۔ بیٹیاں اور بیویاں قربانی کے جانور کی طرح اپنی قسمت کی منتظر رہتی تھیں اور یہ اُس زمانے کا المیہ ہے! اچھے فنکار کی خوبی یہ ہے کہ گرد و پیش میں جو خود

دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، اسی طرح قارئین کو دکھاتا ہے۔ سرسید نے ادیبوں کو نصیحت کی تھی کہ جو کچھ اپنے دل میں ہو، وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ ادب کو زندگی کا آئینہ ہونا چاہیے۔ وہ اسی لیے ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔

روؤشی (۱۹۰۲۔۱۹۳۱) جدید چینی ادب کے پہلے دور کے افسانہ نگار تھے۔ وہ نئے ثقافتی انقلاب میں پیشرو تھے اور اپنی جان کی قربانی دے کر پانچ اولین شہیدوں میں شامل ہوئے۔ نہایت رحم دل اور انسانیت کو خاص اہمیت دینے والے انسان تھے۔ ان کا شمار بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے اہم ترین چینی مصنفوں میں ہوتا ہے۔ ان کی زندگی مختصر تھی۔ فقط تیس سال زندہ رہے۔ لیکن اس مختصر ادبی سفر میں انہوں نے متاثر کن تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے خصوصاً 'فروری میں' اور ''بیوی کی عارضی فروخت'' کا شمار ان کے بہترین افسانوں میں ہوتا ہے۔ ان دونوں افسانوں کا بہت سی زبانوں جیسے انگریزی، فرانچ، روسی اور جاپانی وغیرہ میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ روؤشی چین کے جنوبی صوبے زوجانگ کے رہنے والے تھے۔ وہ اس علاقے کی دقیانوسی رسوم سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان میں سے قبیح ترین رسم کے خلاف اس افسانے میں آواز بلند کی گئی ہے۔ روؤشی پہلے چینی ادیب ہیں جنھوں نے اس پرانے دقیانوسی رسم کو بے نقاب کیا اور مظلوم عورتوں کے لیے انصاف کا نعرہ لگایا۔

احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶۔۲۰۱۰) ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور وہ ادب برائے زندگی یا ادب کی مقصدیت کے قائل تھے۔ وہ ایک حقیقت پسند مصنف تھے، یہی وجہ ہے کہ عوام ان کی تحریروں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ وہ معاشرے کے عام لوگوں کے لیے لکھتے تھے، حقیقی زندگی کی کہانیاں لکھتے تھے۔ ان کے افسانے زیادہ تر پنجاب کے گاؤں کی غریبوں کی دردناک زندگی کے بارے میں ہیں۔ جن میں سنگ دل اور فریب کار امیروں کی دھوکا بازی، منافقت اور ظلم وستم کے ہاتھوں غریب کا استحصال ہوتا رہا ہے۔ غرض کہ وہ خاص طور پر پنجابی گاؤں کے نچلے طبقے کی کہانیاں لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ان غریبوں، محنت کشوں، کسانوں کی زندگی سے قارئین کو روشناس کرانا چاہتے تھے۔ 'بیٹے بیٹیاں' ان کا شاہکار افسانہ ہے، جس میں حقیقی طور پر اس زمانے کے غریب لوگوں کی دردناک زندگی کا اظہار کیا گیا ہے۔

فنی طور پر دیکھا جائے تو 'بیٹے بیٹیاں' اور 'بیوی کی عارضی فروخت' دونوں حقیقت پسند تصانیف ہیں۔ ان میں حقیقت پسندی کی تمام نمایاں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ دونوں افسانوں میں نہایت دلکش اور سادہ انداز و اسلوب کے ذریعے روایات، معاشرت، تمدن کی ایسی عکاسی کی گئی ہے کہ اس کا کوئی پہلو آنکھوں سے اوجھل نہیں رہتا۔ دونوں افسانوں میں دیہی زندگی کے ہر پہلو کو مشاہدے کی گہری نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ایک ہشیار مصور کی طرح الفاظ کی مدد سے خوب صورت تصویریں بنائی گئی ہیں۔ دیہاتی زندگی میں پائی جانے والی عمومی جہالت، ہٹ دھرمی اور شجاعت اور غیرت جیسے جذبات و قدروں کا انکشاف کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی افسانوں کو الفاظ کا ایسا لبادہ پہنا دیا گیا ہے کہ وہ زندہ ءجاوید ہو گئے ہیں۔ دونوں مصنفوں کی تحریریں سادگی، دلکشی اور ندی کی سی روانی سمیٹے ہوئے ہیں، ان کا مشاہدہ گہرا اور وسیع ہے اور انہوں نے معاشرے کے تلخ حقائق کو سچائی اور فن کاری سے اجاگر کیا ہے۔ زندگی سے قریب، زندہ دلی، روح عصر کی عکاسی اور انسانیت سے گہری محبت نے ان کی تخلیقات میں بلا کی تابناکی اور دلکشی پیدا کر دی ہے اور ان کے لفظ لفظ سے زندگی کی کرن پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

حواشی وحوالہ جات

۱۔ روشی کے منتخب افسانے، عوامی ادبی اشاعت گھر، دوسری جلد، ۲۰۲۲ء، ص ۴۴۱
۲۔ ایضاً ص ۴۴۱
۳۔ احمد ندیم قاسمی، برگِ حنا، ناشرین، لاہور، ۱۹۵۹، ص ۱۵
۴۔ ایضاً ص ۱۶
۵۔ ایضاً ص ۱۹
۶۔ ایضاً ص ۱۹
۷۔ احمد حسین، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں سماجی اقتدار، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۶، ص ۴۵۷

References in Roman Script:

1. Roushi kai Muntakhib Afsanye, Awami Adab Ishat Ghar, Dosri Jild,2022, P. 441
2. Ibid, P. 441
3. Ahmed Nadeem Qasmi, Barg-e-Hina, Nashreen, Lahore,1989, P. 15
4. Ibid, P. 16
5. Ibid, P. 19
6. Ibid, P. 19
7. Ahmed Hussain, Ahmad Nadeem Qasmi k Afsano main Samaji Iqtedar, Wafaqi Urdu University braye Fanoon Science o Technology, Islamabad, 2016, P. 457

Professor Kong Julan received her bachelor's degree in Urdu literature from Peking University, China. Currently, she is a senior faculty member at the School of Foreign Languages at Peking University, where she teaches and supervises graduate students.

She has been actively engaged in teaching and research work throughout her career. In addition to Urdu language and literature, Professor Kong has research interests in Pakistani folk literature, Islamic culture, and ethnicity in South Asia and the region. Some of her important works include "Pakistani Folk Literature," "Society and Culture of Pakistan," "Urdu Chinese - Chinese Urdu Bilingual Dictionary," and "Urdu Chinese Dictionary," which also won the second prize in the 13th Philosophy and Social Science Award of Peking University. Her major translations included "Pakistani Folk Stories," and "The Indian Avanti," among others. Professor Kong has also edited "Basic Urdu Textbook (Volumes 1-5)," "Three Hundred Daily Sentences in Urdu," "Urdu Language Self-Study Book," and "Urdu Grammar." All of these are used as teaching materials in all the universities offering Urdu majors in China. She has also published several papers.

In recognition of her services to Urdu, the Government of Pakistan honored her with the medals "Sitara-e-Quaid-e-Azam" in 2003 and "Sitara-e-Imtiaz" in 2023.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 18th Feb, 2024 | Accepted: 11th June, 2024 | Available Online: 30th June, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i01.384

ڈاکٹر عمران ظفر کی مزاحیہ شاعری میں سماجی رویوں پر طنز

Satire on Social Attitudes in Humorous Poetry of Dr. Imran Zafar

DR. ALI BAYAT [1] AND AAMIR BASHIR [2]

[1] Associate Professor, Department of Urdu, University of Tehran, Iran

[2] Research Scholar Urdu, Riphah International University Faisalabad Campus, Pakistan
Corresponding author: Aamir Bashir (ibnebashir705@gmail.com)

ABSTRACT Humor is the integral part of human life. To escape the seriousness and pain of life, Satire and Humor writers created various forms of humor to temporarily diminish the impact of the harsh realities of life. All these writers try to spread a smile on the faces of human being. Due to social disorders, issues and domestic situations; cause mental stress for the modern man. Such a job of humorist is like a good psychiatrist who strives to reduce environment pressure through his humor. This article describes the satires on social attitudes in the humorous poetry of Dr. Imran Zafar, who has currently become the source of reducing nervous conflict of human race. In his poetry he described the different aspects of social attitudes in a very derisory Humorous style. His books "CORONA MERY AGY" (کرونا مرے آگے) and "SHER AYA SHER AYA" (شعر آیا شعر آیا) are the masterpiece of humor writings. His sense of jocularity becomes more entertaining and fascinating while describing the life from different angles. This article not only discusses his writing style but also reflects the way Dr Imran Zafar used to reflect aesthetic sense to show his inclination towards humor as well as he showed the unwanted aspects of social attitudes. After gone through his humorous poetry his satire on social attitudes has been revealed which described for the purpose of making reforms in the society.

Keywords Humor, Society, COVID-19, Distortion, Parody, Satire, Social inequality, humorist.

کوئی بھی معاشرہ جب محرومیوں اور حالات کے نشیب و فراز کی وجہ سے گھٹن محسوس کرنے لگتا ہے تو ادب میں ظرافت کے عناصر اس حبس زدہ ماحول میں تازہ ہوا کے جھونکوں کا کام کرتے ہیں۔ یہ ایک گھٹن زدہ معاشرے میں ہوادان کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں ۔ اردو ادب میں بھی ظرافت نے ہمیشہ استبدادِ زمانہ کے ہاتھوں پیدا ہونے والی محرومیوں اور افسردگی کے چھائے بادلوں کو ہٹانے کا کام کیا ہے۔ اردو زبان و ادب کو آغاز ہی سے بہترین مزاح نگار میسر آئے۔ اردو میں طنز و مزاح کی تاریخ پر طائرانہ نگاہ ڈالنے سے جعفر زٹلی کا بے لاگ طنز مزاح کے پردے میں ملتا ہے تو اکبر الہ آبادی کے کلام میں درد مندی پائی جاتی ہے، راجہ مہدی علی خاں کی خالص مزاح نگاری ہے تو مجید لاہوری کی بے باکی، حاجی لق لق کی کلاسیکی شاعری کی تحریف اور دلاور فگار کے کلام کی شائستگی ملتی ہے۔ قدیم دور سے آگے قدم بڑھائیں تو پطرس بخاری کا منفرد اسلوب اپنی پہچان بنائے ملتا ہے۔ کرنل محمد خان کی شگفتہ تحریروں میں عسکریت مسکرا رہی

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ہے تو شفیق الرحمٰن کے قہقہوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی ترسیلِ زر کا انتظام وانصرام کرتے ہوئے مزاحیہ ادب میں اپنا سکہ بٹھاتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں جن مزاح نگاروں نے اس ادبی روایت کو آگے بڑھایا ان میں ایک نام ڈاکٹر عمران ظفر کا ہے جنھوں نے اپنے طنزیہ ومزاحیہ خیالات واحساسات کے اظہار کے لیے اردو شاعری کو وسیلہ بنایا۔ ادیب چونکہ کسی بھی معاشرے کا سب سے حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ معاشرے میں ہونے والے تغیرات کا سب سے زیادہ اثر لیتا ہے۔ مثبت تبدیلی پر اگر ادیب واہ واہ کرتا ہے تو منفی تغیراتِ زندگی پر آہ کرنے سے نہیں بچ سکتا۔ وہ کسی بھی معاشرتی بگاڑ، کج روی یا ایذا کوشی کو طنز کا نشانہ بنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مقالہ ہذا میں بھی ڈاکٹر عمران ظفر کی شاعری میں مزاح کے پردے میں سماجی رویوں پر کیے گئے طنز کو اجاگر کیا گیا۔ یہ طنز اصلاح معاشرہ کے لیے کیا گیا ہے لہٰذا سماج کے منفی رویوں کو مزاح کے پردے میں پیش کر کے طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

مزاح انسانی زندگی کا جزوِ لازم ہے۔ اسی بنا پر بنی نوع انسان کو حیوانِ ظریف کہا جاتا ہے۔ حسِ مزاح وہ حس ہے جو انسان کو دوسرے تمام جانداروں سے ممتاز بناتی ہے۔ گوتم بدھ کے خیال میں یہ دنیا دکھوں کا گھر ہے اور انسان ہمہ وقت مختلف انواع کے غموں میں گھرا رہتا ہے۔ یحییٰ آرین پور ایک ایرانی محقق کا خیال ہے کہ:

> "وہ ادبی صنف جس کو انگریزی میں سٹیر (satire) کہا جاتا ہے اور فارسی میں طنز کے نام سے پہچانا جاتا ہے، تحریر کا وہ طریقہ ہے جس میں زندگی کے ناموزوں، منفی اور بدصورت پہلوؤں کی ہجو آمیز شکل پیش کی جاتی ہے اور معاشرے کے عیوب اور برائیوں کو یعنی موجودہ صورت سے اغراق کے ساتھ بدصورت اور بدہیئت دکھایا جاتا ہے تاکہ وہ صفات اور خصوصیات واضح ہو کر نظر آئیں۔ اس طرح معاشرے کی موجودہ کیفیت، آئیڈیل صورت سے ممتاز ہو کر سامنے آتی ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ طنز نگار کا قلم ہر مردہ اور بوسیدہ چیز سے اور ہر اُس چیز سے جو زندگی کی ترقی اور پیشرفت کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے، کسی درگزر اور بخشش کے بغیر، لڑتا ہے۔"(۱)

جب طنز نگار کی یہ حیثیت ہے تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسان نے مشکلات، غم اور دکھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے مزاح کا سہارا لیا۔ زندگی کی سنجیدگی اور آلام سے بچنے کے لیے مزاح نگاروں نے مختلف صورتوں میں مزاح تخلیق کیا تاکہ زندگی کے تلخ حقائق کی مدت کو عارضی طور پر کم کیا جاسکے۔ طنز ومزاح نگار وقتی طور پر مزاح کے رنگ بکھیر اور طنز کے نشتر چلا کر انسان کے لبوں پر تبسم بکھیرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "زندگی چونکہ کسی ایک رنگ، رویے، زاویے اور رواج کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ کار لامحدود ہے۔ اسی طرح زندگی کی عکاسی کرنے والے ادب میں بھی بے شمار رنگ اور رویے ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں ایک رنگ یا رویہ طنز ومزاح کا بھی ہے جو اتنا ہی قدیم ہے جتنا بذاتِ خود ادب یا زندگی۔"(۲)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ڈاکٹر عمران ظفر عہدِ حاضر کے نامور مزاح نگار ہیں۔ وہ ۸ مارچ ۱۹۷۸ء میں جھنگ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے میٹرک کا امتحان ۱۹۹۳ء میں گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول، جھنگ سے پاس کیا۔ ایف اے کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ۱۹۹۵ء میں فیصل آباد بورڈ سے پاس کیا۔ ۱۹۹۷ء میں گورنمنٹ کالج جھنگ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اورینٹل کالج، لاہور سے ایم اے اردو کا امتحان ۲۰۰۰ء میں پاس کیا۔ بعد ازاں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد سے ''اردو شاعری میں تحریف نگاری کی روایت'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ قلمبند کر کے ایم فل اردو کی۔ ۲۰۱۴ء میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد سے ''اردو ادب میں فیض شناسی کی روایت'' پر ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی مکمل کی۔ ڈاکٹر عمران ظفر ۲۰۰۲ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کے تحت ہائر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں اردو کے لیکچرر منتخب ہوئے اور آج کل بطور پروفیسر اور صدرِ شعبہ اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔

اردو ادب میں وہ بحیثیت مزاح نگار شاعر، محقق، نقاد، مدون مدیر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کی سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری ایک منفرد رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر عمران ظفر نے طنز و مزاح کے پردے میں جن معاشرتی ناہمواریوں اور انسانی رویوں کو موضوع بنایا ہے وہ ہماری معاشرت کے تلخ حقائق ہیں۔ انھیں بطور فیض شناس بھی ادبی دنیا میں جانا جاتا ہے۔ انھوں نے زمانہ طالب علمی ہی میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں جو ''نونہال'' اور ''تعلیم و تربیت'' میں شائع ہوئیں۔ بعد ازاں شاعری، تدوین، تحقیق اور تنقید کی جانب راغب ہوئے۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ روزنامہ ''صداقت'' لاہور سے بھی وابستہ رہے۔ مزاحیہ شاعری کے حوالے سے ان کے اب تک درج ذیل شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

۱۔ شعر آیا شعر آیا

مزاحیہ شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر عمران ظفر کا یہ پہلا شعری مجموعہ ۲۰۱۹ء میں کری ایٹو پبلشرز، فیصل آباد سے شائع ہوا۔ ایک سو اکیس صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعے کا دیباچہ پروفیسر ڈاکٹر مختار حر نے ''شعر تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک ترا'' کے عنوان سے لکھا جس میں انھوں نے جھنگ کی ادبی روایت اور ڈاکٹر عمران ظفر کی مزاحیہ شاعری کے خصائص بیان کیے ہیں۔ یہ شعری مجموعہ مزاحیہ نظموں، غزلوں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب پر ڈاکٹر انعام الحق جاوید، ڈاکٹر سعید احمد اور ڈاکٹر محمد سعید کی آراء بھی شامل ہیں۔

۲۔ کرونا مرے آگے

ڈاکٹر عمران ظفر کا دوسرا مزاحیہ شعری مجموعہ ''کرونا مرے آگے'' کے عنوان سے ۲۰۲۰ء میں کری ایٹو پبلشرز، فیصل آباد سے شائع ہوا۔ اس شعری مجموعے کا دیباچہ عصرِ حاضر کے معروف مزاحیہ شاعر ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی نے ''ڈاکٹر عمران ظفر کی کرونائی شاعری'' کے عنوان سے لکھا۔ اس کے علاوہ معروف مزاح نگار ڈاکٹر محسن گھمیانہ نے اپنی رائے ''ہنسو نا مرے آگے'' کے عنوان سے قلمبند کی ہے جو اس شعری مجموعے میں شامل ہے۔ اس شعری مجموعے کا عنوان مرزا غالب کے ایک مصرعے میں تحریف کر کے رکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں عطاء الحق قاسمی، سرفراز شاہد، ڈاکٹر انعام الحق جاوید اور ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری کی آراء بھی فلیپ پر موجود ہیں۔ تحقیق، تنقید، ترتیب، تدوین اور طبع زاد کتب کے زمرے میں ڈاکٹر عمران ظفر کی درج ذیل کتب رکھی جا سکتی ہیں:

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

۱۔	"تحریفاتِ کلام اقبال"	(تحقیق و ترتیب)
۲۔	"فیض کے نایاب خطوط"	(تحقیق و ترتیب)
۳۔	"کفِ گل چیں"	(تحقیق و ترتیب)
۴۔	"خواب دیدہ"	(مضامین کا انتخاب)
۵۔	"کلیات صفدر سلیم"	(تحقیق و ترتیب)
۶۔	"دشتِ محبت"	(سنجیدہ شاعری)
۷۔	"اردو شاعری میں پیروڈی کی روایت"	(زیر طبع)

ادیب چونکہ کسی بھی معاشرے کا سب سے بڑا نبض شناس ہوتا ہے وہ جہاں بھی معاشرے کے جسم میں فاسد مادوں کو دیکھتا ہے وہاں طنز کے نشتر لیے سرجری کے لیے پہنچ جاتا ہے۔ اس کا نشتر فاسد مادوں کو نکالتا بھی رہتا ہے اور متاثرہ شخص کو ہنساتا بھی رہتا ہے۔ ادیب کا کام اپنے مشاہدے کے بل بوتے پر سماجی اور معاشرتی بیماریوں کی نشاندہی کر کے ان کی اصلاح کے اسباب بتانا ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انور جمال:

> "زندگی کی مضحک صورتِ حال کا مشاہدہ کر کے اس کا ٹھٹھہ اُڑانا "مزاح" ہے۔ حیات کی وہ ناہمواریاں جو عام انسانوں کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں ایک دور بین فنکار انہیں نہایت قریب سے دیکھتا ہے اور پھر اس پر اس انداز سے فقرے کستا ہے کہ اس کا مذاق تخلیقی پیرایہ اختیار کر لیتا ہے۔"(۳)

مزاحیہ شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر عمران ظفر نے اپنے گوناگوں اور متنوع افکار و خیالات کو اشعار کے پیکر میں ڈھالا ہے اور انھیں مزاح کا رنگ دیا ہے۔ ان کی شاعری میں انسان کے معمولاتِ زیست کو ظریفانہ انداز میں موضوع بنا کر شعری صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے حالات و واقعات اور مسائل و عوامل کو فکاہیہ انداز میں شاعری کے ذریعے قاری کے سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ذیل میں ڈاکٹر عمران ظفر کی مزاحیہ شاعری کے موضوعات، اماثل اور دیگر خواص کا تحقیقی انداز میں احاطہ کرتے ہوئے ان کے دو مزاحیہ شعری مجموعوں کے تناظر میں لیا گیا ہے۔

اردو کے مزاحیہ شعری ادب میں جعفر زٹلی سے لے کر معاصر دور کے مزاحیہ شاعروں نے معاشرے میں پھیلی بد عنوانی کو موضوع بنایا ہے اور متنوع انداز میں اس پر چوٹ کی ہے۔ ڈاکٹر عمران ظفر چونکہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خود ایک سرکاری افسر بھی ہیں اسی لیے وہ سرکاری دفاتر میں بد عنوان عناصر اور کالی بھیڑوں کی کارستانیوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ انھوں نے اپنی مزاحیہ شاعری میں ان عناصر کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ڈاکٹر عمران ظفر نے ایک رشوت خور سرکاری افسر کی کرپشن بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی پستی اور نفسیاتی حقیقت کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔ اس حوالے سے ان کا قطعہ "ایمان دار افسر" پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

رقعہ نہ سفارش پہ کب کام کیے میں نے؟
اس سال ہوئی جتنی میرٹ ہی پہ بھرتی ہے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

کچھ لوگوں سے میں نے ہاں! رشوت ہی طلب کی ہے
"ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے"(۴)

بدعنوانی اور کرپشن کے تناظر میں ان کی لاجواب مزاحیہ نظم "قلفی کھوئے ملائی والی" لائقِ تحسین ہے۔ اس میں انھوں نے بدعنوان عناصر کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ جعلی ڈگری لے کر ایوانِ اقتدار میں پہنچنے والے سیاستدانوں پر چوٹ کی ہے۔ اقربا پروری، سفارش اور رشوت طلب کر کے میرٹ کی دھجیاں بکھیرنے والے عناصر کو بھی انھوں نے بے نقاب کیا ہے۔ ایک غزل میں انھوں نے ان ممتحنین پر طنز کیا ہے جو پیسے لے کر نالائق بچوں کو امتحانات میں کامیابی دلانے میں سہولت کاری کرتے ہیں۔ اسی طرح "قومی ادارہ برائے احتساب" کی کارستانیوں کو بھی انھوں نے بے نقاب کیا اور رشوت ستانی، سیاستدانوں کی نااہلی اور مفاد پرستی پر خفیف انداز میں طنز کی ہے۔

میاں بیوی کی نوک جھونک

ڈاکٹر عمران ظفر کی مزاحیہ شاعری میں شوہر اور بیوی کے درمیاں نوک جھونک کو شگفتہ انداز میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ میاں بیوی اردو مزاحیہ شعرا کا محبوب موضوع ہے جس کو ہر مزاحیہ شاعر نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے علامہ اقبال کی نظموں "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" کی طرز پر دو نظمیں "شوہر کا شکوہ" اور "بیوی کا جوابِ شکوہ" کے عنوانات سے قلمبند کی ہیں۔ شوہر زن مریدی اور بیوی کے طعنے سننے سے اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتا ہے:

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
زن مریدی ہی کروں اور میں مدہوش رہوں
طعنے بیگم کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں کوئی بزدل ہوں جو خاموش رہوں(۵)

دوسرے بند میں اپنی بیوی کی ظاہری شکل و صورت پر طنزیہ وار کرتا ہے اور اس کے ڈولے کو موت کے گولے سے تشبیہ دیتا ہے۔ وہ خواتین کے بناؤ سنگھار کو ایک فریب اور سراب قرار دیتا ہے اور بیوی کی احسان فراموشی پر شکوہ کناں ہے۔ دوسری نظم میں "بیوی کا جوابِ شکوہ" میں بیوی کے گلے شکوے اور شوہر کی برائیوں کو مزاحیہ انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ وہ اپنے شوہر کی کنجوسی، بے وفائی اور گنجے پن پر طنزیہ جملے کستی ہے۔ ساس اور بہو کے مابین پیدا ہونے والی رقابت اور بیوی کی فرمائشیں پوری نہ ہونے پر جو طنزیہ وار خواتین کرتی ہیں اور جلی کٹی سناتی ہیں، ان کو ڈاکٹر عمران ظفر نے مذکورہ نظم میں کامیابی سے اس نظم کی صورت میں بیان کیا ہے۔ ذیل میں نمونے کے طور پر دو اشعار دیے گئے ہیں جو بیوی کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں:

سیلری اپنی، فقط ماں کو تھمائی تو نے
آج تک مجھ کو کبھی سیر کرائی تو نے؟
کوئی ساڑھی، کوئی پشواز دلائی تو نے؟
ایک بھی رسمِ وفا مجھ سے نبھائی تو نے؟(۶)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

شاعر نے ایک غزل صفدر سلیم سیال کی نذر کی ہے، اس میں بھی شوہر اور بیوی کے درمیان ہونے والی نوک جھونک کو کامیابی سے موضوع بنایا ہے۔ میاں اور بیوی کے جذبات پر انھوں نے کئی نظمیں، غزلیں اور قطعات تخلیق کیے ہیں۔ انھوں نے اپنی مزاحیہ شاعری میں میاں اور بیوی کو جس انداز میں پیش کیا ہے، یا جس طرح ازدواجی معاملات سے مزاح پیدا کیا ہے، وہ قابلِ تحسین ہے کیونکہ بہترین مزاحیہ شاعر وہی ہوتا ہے جو گردوپیش کے احوال اور انسانی نفسیات کو ملحوظِ خاطر رکھے۔ ازدواجی زندگی کے مثبت اور منفی پہلو بیان کرتے ہوئے ان کے اشعار بھرپور مزاح سے لبریز نظر آتے ہیں۔

کرونائی مزاحیہ شاعری

کرونا وائرس ایک خطرناک نوعیت کا خوردبینی جرثومہ ہے۔ اس کی شناخت پہلی بار ۲۰۱۹ء میں چین کے شہر ووہان میں ہوئی۔ یہ وائرس تیزی سے پھیلنے والی وبا کی شکل میں پوری دنیا میں پھیلا جس کی وجہ سے پوری دنیا کا نظام منجمد ہو کر رہ گیا اور ہر انسان ایک دوسرے سے سماجی فاصلہ رکھنے لگا۔ اس ساری صورت حال پر مختلف ادیبوں اور تخلیق کاروں نے اپنے فن پارے تخلیق کیے۔ عمران ظفر نے کرونا وائرس کی وجہ سے ہماری انفرادی اور سماجی زندگیوں، معاشرت اور رویوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو فکاہیہ انداز میں موضوع بنایا اور تضمین نگاری اور تحریف نگاری جیسے حربوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کرونائی صورت حال کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کا ایک قطعہ بعنوان ''کرونا مرے آگے'' پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں کرونا وبا کے ساتھ ساتھ مچھر سے پیدا ہونے والی وبا ڈینگی پر بھی مزاحیہ صورت حال پیدا کی گئی ہے:

سو بار وباؤں سے لڑا ہوں میں، اگرچہ
''آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے''
کس سمت میں جاؤں کہ وباؤں میں گھرا ہوں
ڈینگی مرے پیچھے ہے، کرونا مرے آگے(۷)

ڈاکٹر عمران ظفر نے کرونا وبا کی وجہ سے پریشان حال اور پژمردہ چہروں پر اپنے مزاحیہ کلام سے ہنسی بکھیرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس عالمی وبا کے تناظر میں ہونے والے سماجی رویوں میں تبدیلی، اخلاقی زبوں حالی اور مذہبی منافرتوں کو ہوا دینے کی سازشوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مزاح کا سہارا لیا ہے۔ اپنی مزاحیہ شاعری میں لطیف پیرائے سے جس سلیقے اور مہارت سے کرونائی وبا کے مختلف پہلوؤں، اس کے سماجی اثرات، عالمی پابندیوں اور غیر سنجیدہ انسانی رویوں سے قاری کو ہلکے پھلکے اور دلچسپ انداز میں آگاہ کیا ہے، یہ انہی کا اختصاص ہے۔ خطرناک وائرس سے پریشان حال عوام کو گدگدانے کی کوشش کرتے ہوئے انھوں نے کرونا کے اثرات پر کئی مزاحیہ قطعات اور غزلیں لکھی ہیں۔ "واہ رے کرونا...!" میں انھوں نے لاک ڈاؤن کے سبب آبادی میں ہونے والے اضافے کو بیان کیا ہے۔ قطعہ ''لاک ڈاؤن'' خانگی جھگڑوں اور انسانوں میں پیدا ہونے والی کاہلی کو بیان کیا ہے۔ ''اے کاش'' میں کرونا کا علاج دیسی ٹوٹکوں سے کرنے والی عوام کو آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے۔ انھوں نے ہماری قوم میں پھیلی اجتماعی جہالت کو بھی کرونا وبا کے تناظر میں طنز کا نشانہ بنایا ہے:

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ہمیں جو صدیوں سے لاحق مرض ہے اس کی جگہ
کرونا کچھ بھی نہیں، عارضی مصیبت ہے
دعا ہے رب سے یہی اس سے بھی نجات ملے
ہماری قوم کی رگ رگ میں جو جہالت ہے(۸)

ڈاکٹر عمران ظفر نے مہارت سے انسانی روزمرہ زندگی کو کرونا وبا کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور ظریفانہ انداز اختیار کیا ہے۔

عیدِ قرباں

اردو مزاحیہ شاعری میں عیدِ قرباں ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر عمران ظفر نے بھی لاتعداد قطعات، نظمیں اور غزلیں اس حوالے سے تخلیق کی ہیں۔ انھوں نے عید قرباں پر ہماری زیادہ کھانے کی عادت پر طنز کیا ہے۔ اس حوالے سے قطعہ ''بکرا عید پر'' پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس قطعے میں عیدِ قرباں پر طبقاتی اثرات کو شگفتہ پیرائے میں قلمبند کیا گیا ہے اور معاشی طور پر بدحال طبقے کے احساسِ محرومی پر دکھ کا اظہار کیا ہے۔ نظم ''اصلی بکرے کی پہچان'' میں انھوں نے بکروں کی شکل وصورت اور جدید اقسام بیان کی ہیں۔ بکروں کی شناخت کے حوالے سے بھی شگفتہ پیرائے میں بحث کی ہے۔ اس حوالے سے درج ذیل اشعار قاری کے لبوں پر تبسم بکھیر دیتے ہیں:

اگر جیکٹ پہن کے پھر رہا ہو بکرا منڈی میں
سمجھ لینا کہ فاٹا سے ہے طالبان کا بکرا
اگر تجھ کو کہے ''تینکوں'' اگر خود کو کہے ''مینکوں''
میانوالی سے ہوگا یا کہیں ملتان کا بکرا
اگر چارہ چباتے، بیڑا و نسوار مانگے وہ
تو پھر ہوگا پشاور سے کسی اک خان کا بکرا(۹)

شاعر نے عید قرباں پر گوشت کی غیر منصفانہ تقسیم اور قصائیوں کی لوٹ مار پر طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ ''کرونائی عید مبارک'' میں کرونا کی صورت حال میں عید کے تہوار اور اس تناظر میں سماجی فاصلے کو مزاحیہ طور سے بیان کیا ہے۔

ملکی مسائل کی عکاسی

وطنِ عزیز پاکستان کو کئی نوعیت کے مسائل درپیش ہیں۔ برآمدات کی کمی، ماحولیاتی آلودگی، آب وہوا میں تبدیلی، زرعی زمین کا تیزی سے کم ہوتے جانا، توانائی کا بحران، جہالت، آبادی میں بے قابو اضافہ وغیرہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ڈاکٹر عمران ظفر چونکہ ملکی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں، اسی لیے انھوں نے پاکستان کو لاحق خطرات کو طنزیہ انداز میں اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے پاکستان میں دہشت گردی کے سبب ہونے والے جانی ومالی نقصان پر روشنی ڈالی ہے اور دہشت پسندوں اور خودکش بمباروں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اس تناظر میں ان کا قطعہ ''فدائی'' قابلِ مطالعہ ہے:

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

جرمِ عظیم کر کے شہادت کے نام پہ
وہ بے گناہ جانوں کا نقصان کر گیا
خود کو اڑا کے بم کے دھماکے سے، رات کو
"اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا"(۱۰)

پاکستان میں زیادہ تر توانائی تیل اور ایندھن کے دیگر ذرائع سے بنائی جاتی ہے اور یہ اشیا پاکستان درآمد کرتا ہے جس پر کثیر تعداد میں زرِ مبادلہ خرچ ہوتا ہے۔ ہمارے اربابِ اختیار نے بجلی پیدا کرنے کے دیگر ذرائع جیسے شمسی توانائی، جوہری توانائی، پن بجلی اور ہوا سے بجلی پیدا کرنے کے حوالے سے کام نہیں کیا جس کی وجہ سے پاکستان اپنی توانائی کی طلب اور رسد میں توازن پیدا کرنے میں یکسر ناکام ہے۔ ڈاکٹر عمران ظفر نے اس بحران کو پاکستان کا ایک بڑا مسئلہ قرار دیا ہے۔ پاکستان میں مئی تا ستمبر پانچ ماہ شدید گرمی پڑتی ہے۔ گرمی کے ستائے ہوئے عوام کو لوڈشیڈنگ کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو انھیں دوہرے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انھوں نے اس تناظر میں "گرمی اور لوڈشیڈنگ" کے عنوان سے تخلیق کردہ قطعے میں صورت حال کی گھمبیرتا کو یوں بیان کیا ہے:

سارا سارا دن کبھی بجلی یہاں ہوتی نہیں
ہر کوئی رونا ہے روتا بیٹھ کے تقدیر کا
کس قدر جینا ہے مشکل ہم سے یہ ہرگز نہ پوچھ
"صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا"(۱۱)

انھوں نے "بجلی کی لوڈشیڈنگ" کے عنوان سے لکھے گئے قطعے میں کاروبار اور معیشت پر لوڈشیڈنگ کی وجہ سے پڑنے والے اثرات پر ٹھٹھہ اڑایا ہے۔ وہ اپنے ملک کی حالت زار پر اپنے اربابِ اختیار پر پھبتی کستے نظر آتے ہیں۔ توانائی کے بحران کے بعد مہنگائی میں ہوش ربا اضافہ بھی غریب عوام کے لیے بڑا مسئلہ ہے جس نے عوام کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ انھوں نے لاک ڈاؤن میں غریب آدمی کو درپیش معاشی مشکلات کو موضوع بنایا ہے۔ اس حوالے سے جنید آزر کی غزل میں تحریف نگاری کرتے رہوئے ظریفانہ پہلو کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا ہے:

وبا کو مفت میں بدنام کر ڈالا زمانے نے
غریبوں کو تو فاقوں ہی کی نوبت مار دیتی ہے(۱۲)

بین الاقوامی معاملات

ڈاکٹر عمران ظفر نے ملکی معاملات کے ساتھ بین الاقوامی سیاسی، معاشی، سماجی، دفاعی حالات اور خارجہ پالیسی پر بھی شعر تخلیق کیے ہیں اور فکاہیہ انداز اپنایا ہے۔ وہ ایک ماہر صحافی کے مانند پاکستان کے بین الاقوامی تعلقات پر بھی بھرپور نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اس تناظر میں ان کا قطعہ "واٹر ڈے" اہمیت کا حامل ہے۔ اس قطعے میں انھوں نے بھارت اور پاکستان کے مابین ہونے والے سندھ طاس معاہدے اور بھارت کی جانب سے کی جانے والی صریحاً خلاف ورزی پر پھبتی کسی ہے۔ شاعر نے بھارت کی آبی جارحیت کے ساتھ ساتھ

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

اقوامِ متحدہ کی معنی خیز خاموشی، مجرمانہ غفلت اور دوہرے معیار پر طنز کی ہے۔ ''واہ رے پڑوسی'' کے عنوان سے تخلیق کردہ قطعے میں بھارت کی منافقانہ اور مکارانہ پالیسیوں پر طنز ہے۔ بھارت میں حکمران طبقے کی بنیاد پرستی، شدت پسندی، دہشتگردی، ہندو سوچ اور چانکیائی سیاست کو بے نقاب کیا ہے اور بظاہر دوستی بباطن دشمنی پر طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ اس حوالے سے درج ذیل اشعار صورت حال کو واضح کر دیتے ہیں:

بہت کرتا ہے دعوے دوستی کے
نبھاتا پر نہیں وعدے وفا کے
کبھی ہے روکتا دریا کا پانی
کبھی کروا رہا ہے بم دھماکے[۱۳]

بھارت کے بعد انھوں نے امریکی حکمران طبقے کی مسلم دشمنی اور توسیع پسندانہ عزائم کو بے نقاب کیا ہے۔ انھوں نے اپنے شگفتہ انداز میں امریکہ کی دوسرے ممالک کے ساتھ منافقت کو پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کا قطعہ ''انکل سام'' اہم ہے جس میں وہ امریکی دوہری پالیسی پر ٹھٹھول کرتے ہیں:

تم اپنا فائدہ پیش نظر رکھتے ہو چاچا جی
تمہاری حکمت عملی سے دل نہ بدگماں کیوں ہو؟
تمہاری دوستی خطرے سے خالی ہو نہیں سکتی
''ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟''[۱۴]

ان کے علاوہ انھوں نے یورپ کی سماجی و معاشی صورت حال، پاکستان پر آئی ایم ایف اور دیگر عالمی مالیاتی اداروں کی اجارہ داری اور پاکستان کی ناکام خارجہ پالیسی پر ہمارے ارباب اختیار کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔

تہذیبی زوال کا نوحہ

پاکستان کی تہذیب و ثقافت مختلف ثقافتوں کا اقدار کا ملغوبہ ہے۔ اس تہذیب پر یورپی اور ہندی اثرات نمایاں اور غالب ہیں۔ اس کا اثر ہماری خوراک، طرزِ لباس، طرز تعمیرات اور دیگر سماجی شعبوں پر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ادیب چونکہ معاشرے کا نباض اور ترجمان ہوتا ہے۔ معاشرے کی نبض پر اس کا ہاتھ ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وہ معاشرے کے حقیقی مسائل اور معاملات کو موضوع بناتا ہے۔ ڈاکٹر عمران ظفر نے ہماری تہذیب پر بھارتی تہذیب کے اثرات اور اسباب کا جائزہ لیا ہے۔ اس تناظر میں ان کی نظم بعنوان ''سٹار پلس'' اہم ہے جس میں ہمارے تہذیبی زوال کا نوحہ پڑھا گیا ہے اور نوجوان نسل کی تہذیبی تبدیلی پر طنزیہ وار کیے گئے ہیں:

ہوا ہے ہندی ڈرامے کا راج کیا کہیئے
عجب طرح کا بنا ہے سماج کیا کہیئے
یہی جو حال رہا ایک دن وہ آئے گا

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

یہ آسماں مری میت کو یوں رلائے گا
بلائیں گے کسی پنڈت کو میرے گھر والے
مری چیتا کو جلائیں گے میرے گھر والے(۱۵)

انھوں نے مختلف تقاریب، رسوم ورواج، خلاقی پسماندگی اور تہذیبی اقدار کی بکھرتی دھجیوں کا نوحہ بھی پڑھا ہے۔

شعبہ طب کی حالت زار

پاکستان میں عام شخص کو صحت کی معیاری سہولیات میسر نہیں ہیں۔ سرکاری ہسپتال تعداد میں نہایت کم ہیں۔ پاکستانی ڈاکٹروں نے مہنگے نجی شفاخانے کھول رکھے ہیں جن سے علاج کرانا اوسط یا کم آمدن والے افراد کی بس کی بات نہیں۔ ڈاکٹر عمران ظفر نے ایسے لالچی اور بے ضمیر ڈاکٹروں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ انھوں نے اس سنجیدہ اور پریشان کن مسئلے کو بھی ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم بعنوان ''پرائیویٹ کلینک پر'' کے آخری اشعار اس تناظر میں طبی شعبے کا ٹھٹھہ اڑاتے ہیں:

یاد تھیں جتنی دوائیں کر دیں کاغذ پر رقم
''نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کا شغر''
میں دوا لے کے کلینک سے چلا ہی تھا کہ پھر
بھاگ کر آیا کہیں سے ان کا اپنا ہی پسر
ہاتھ میں کاغذ تھے پکڑے، باپ سے بولا یہی
یہ رپورٹ ان کی نہیں تھی ان کو تو ہے درد سر
یہ کوئی اظفر علی تھے، جن کا ناقص ہے جگر
اور جنہیں اب چیک کیا ہے یہ تو ہیں عمران ظفر(۱۶)

اسی طرح قطعہ ''ہومیوپیتھک'' میں ہومیوپیتھی طریقہ علاج اور ڈاکٹروں کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے جو شعور کے فقدان اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کئی موذی اور جان لیوا بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ اپنا علاج مستند طبیب سے کرانے کے بجائے دیسی نیم حکیم سے کراتے ہیں۔

اردو طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں شعرا پر طنز کی روایت بھی خاصی مستحکم ہے۔ ڈاکٹر عمران ظفر نے اپنی طنزومزاحیہ شاعری میں مسلسل شاعر اور شاعرات پر طنز کے وار کیے ہیں اور ان کی حرکات وسکنات کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے قطعہ بعنوان ''شاعر اور روزہ'' میں انھوں نے شعرائے کرام کی نازک مزاجی پر انھیں آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ ایک شاعر روزہ رکھ کر اپنی آپ بیتی سناتے ہوئے یوں گویا ہوتا ہے:

گرمیوں میں روزہ رکھ کے حال میرا یہ ہوا
جس طرح فتراک میں عالم ہو اک نخچیر کا

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

سولہ گھنٹے کس طرح کٹتے ہیں کیا بتلاؤں میں
"صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا"(۱۷)

ڈاکٹر عمران ظفر ایک غزل میں ایسے شعرا کا چالان کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جو شعر گوئی کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کرتے۔ "شاعرِ زلزلہ انگیز" میں انھوں نے ایسے تمام شعرا کو آڑے ہاتھوں لیا ہے جو مشاعرے میں اتنے زور سے اپنا کلام سناتے ہیں کہ ان کی ولولہ انگیزی در حقیقت زلزلہ انگیزی بن کر رہ جاتی ہے۔ "واہ رے شاہد اشرف" کے عنوان سے لکھے گئے قطعہ میں شاعر نے اپنی ذات اور اپنی مزاحیہ شاعری کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اسی طرح کرونائی صورت حال اور لاک ڈاؤن میں شعرا کی عادات و اطوار کو شاعری کے پیرائے میں ڈھال کر مزاحیہ صورت حال پیدا کی گئی ہے۔

انھوں نے ہمارے معاشرے کے مختلف طبقات اور افراد کی غیر متوازن حرکات و سکنات کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ ان طبقات میں استاد، دانش ور، جج، پولیس اہلکار اور مولوی حضرات شامل ہیں۔ وہ معذور بچوں کو دینی تعلیم دینے اور دماغی طور پر تندرست اور ذہین بچوں کو دنیوی تعلیم دینے اور ڈاکٹر، انجینئر اور افسر بنانے پر انگشت بدنداں ہیں۔ یہ ہمارا اجتماعی المیہ ہے کہ ہم نے مذہب کو سب سے آخری ترجیح رکھا ہوا ہے۔ اس حوالے سے ان کا قطعہ "لوگ" قابلِ غور ہے اور ہمارے رویوں پر طنز ہے:

ہو اگر بے عیب بچہ ہر گھڑی رکھ کے نظر
ڈاکٹر، انجینئر، افسر بنالیتے ہیں لوگ
اتفاقاً وہ اگر نابینا و معذور ہو
مدرسے کے بچوں میں کیونکر بٹھادیتے ہیں لوگ(۱۸)

ہمارے پولیس کے محکمے کی غلط کاریوں کو بے نقاب کرنے کے لیے انھوں نے کئی قطعات اور اشعار تخلیق کیے ہیں۔ ان میں "تھانے میں"، "دورانِ تفتیش"، "ٹریفک سارجنٹ" وغیرہ جیسے قطعات نمایاں ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ہمارے نظامِ انصاف کی سست روی اور دوہرے معیار کو بھی خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے جس میں امیر اور غریب کے لیے الگ الگ قوانین ہیں۔ اس حوالے سے ان کا قطعہ بعنوان "انصاف" پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

دیس کا حال سناؤں تو بھلا کیسے، کبھی
کسی منصف، کسی رہبر کو بھی تقویٰ نہ ہوا
ساٹھ سالوں سے سنتے ہیں ملے گا انصاف
"ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا"(۱۹)

انھوں نے عہدِ حاضر کے مسلمانوں کی نفسیات اور عادات و اطوار کا نقشہ کھینچا ہے۔ قطعہ "عصرِ حاضر کا مسلمان" میں مسلمانوں کی بے عملی، کاہلی اور بے ضمیری کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ انھوں نے ہمارے ذرائع آمد و رفت کی حالتِ زار، ہماری سڑکوں کی ناگفتہ بہ صورت حال، پاکستان میں بھکاریوں کی تعداد میں اضافے، حکومتی نظام کی خرابیوں، معاشرے میں موجود برائیوں، ناہمواریوں اور انفرادی و

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

اجتماعی غیر متوازن رویوں، نام نہاد عاشقوں اور ان کی عجیب و غریب و مضحکہ خیز حرکات و سکنات پر بھی پھبتیاں کسی ہیں۔ یہ کہنا قطعی طور پر مبالغہ نہ ہو گا کہ انھوں نے مہارت سے متنوع افکار و خیالات اور موضوعات کو بیان کرنے کے لیے طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا سہارا لیا ہے۔ ایک غزل میں عشاق کو وہ طنز کا نشانہ ان الفاظ میں بناتے ہیں:

نالہ و فریاد سے شب بھر جسے فرصت نہ ہو
عاشق بے جان کا چالان ہونا چاہیئے
عاشقوں کے چین کو جو لوٹ لیتی ہے
ایسی ہر مسکان کا چالان ہونا چاہیئے(۲۰)

ڈاکٹر عمران ظفر کی مزاحیہ شاعری میں مزاح پیدا کرنے کے حربوں کا ذکر کیا جائے تو انھوں نے اپنی مزاحیہ شاعری میں زیادہ تر تحریف نگاری سے کام لیا ہے۔ تحریف نگاری کا انگریزی مترادف پیروڈی ہے۔ پیروڈی ایسے منظوم یا منثور اشعار یا الفاظ ہیں جن میں ایک یا ایک سے زائد مصنفین کے کلام کی روح اور خصوصیات کی یوں نقل کی جائے کہ وہ مضحکہ خیز معلوم ہوں۔ اس کے تین طریقے ہوسکتے ہیں۔ الفاظ کی تبدیلی اور کمی بیشی، مصنف یا شاعر کے انداز و اسلوب کی نقل یا پھر موضوع اور ہیئت کی نقل۔ ان کے علاوہ مصرعوں کی پیوستگی سے بھی پیروڈی کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"پیروڈی کا مقصد کسی مصنف کی تحریر یا اشعار کی نقل سے مزاح پیدا کرتے ہوئے اس تحریر یا اشعار سے وابستہ مفہوم، تصور، نقطہ نظر یا خیال کو کم عیار ثابت کر کے غیر اہم قرار دینا یا پھر مسترد کرنا ہے۔ اردو میں پیروڈی کے لیے تحریف کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔"(۲۱)

ڈاکٹر عمران ظفر نے اپنی شاعری میں مزاح کے اس حربے کا استعمال جابجا کیا ہے۔ اس تناظر میں ان کا شعری مجموعہ ''کرونا مرے آگے'' زیادہ اہم ہے۔ اس شعری مجموعے کا عنوان ہی تحریف نگاری کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ تحریف نگاری سے ان کا تعلق زمانہ طالب علمی سے ہے۔ انھوں نے ''کرونا مرے آگے'' میں ایک ہی موضوع پر تحریف نگاری کی ہے جو ایک مشکل کام ہے۔ وہ معروف مصرعوں پر اس طرح گرہ لگاتے ہیں کہ وہ مصرع ان کا ذاتی معلوم ہونے لگتا ہے۔ تحریف نگاری کے لیے انھوں نے مختلف شعرا کی غزلیات پر طبع آزمائی کی ہے۔ مگر تمام اشعار کو اس مہارت سے بیان کیا ہے کہ قاری داد دیئے بنا نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر بہادر شاہ ظفر کی مشہور غزل کی پیروڈی انھوں نے اس سلیقے سے کی ہے کہ قاری ان کی پیروڈی پر عش عش کر اٹھتا ہے:

خوف و ہراس پھیلا ہے قرب و جوار میں
جب سے یہ وبا آئی ہے اپنے دیار میں
اک پل تو یوں لگا کہ کرونا مجھے بھی ہے
میں نے علامتیں جو پڑھیں اشتہار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفر دید کے لیے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

دو ہفتے سے گزر نہ ہوا کوئے یار میں(۲۲)

انھوں نے جن شعرائے کرام کے کلام کی پیروڈیاں لکھی ہیں، ان میں میر تقی میر، انشاء اللہ خاں انشا، حیدر علی آتش، بہادر شاہ ظفر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، مرزا اسد اللہ خان غالب، مومن خاں مومن، داغ دہلوی، اکبر الٰہ آبادی، علامہ اقبال، حسرت موہانی، یاس یگانہ چنگیزی، جگر مراد آبادی، فیض احمد فیض وغیرہ کے نام، نمایاں ہیں۔ ان کے علاوہ قطعات کی صورت میں بھی پیروڈی کی عمدہ مثالیں کلامِ ڈاکٹر عمران ظفر میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ انہوں نے تضمین نگاری سے بھی مزاح پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ تضمین سے مراد اپنے یا کسی دوسرے شاعر کے مصرعے یا شعر پر مصرع لگانا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک مصرعے پر ایک مصرع لگانا، ایک شعر پر ایک مصرع لگا کر مثلث بنانا، مطلع پر مطلع لگانا، شعر پر تین مصرعے لگا کر مخمس کرنا، شعر پر چار مصرعے لگا کر مسدس کرنا، کئی شعر لگا کر قطعہ بند کرنا یا قطع میں ایک مصرعہ لگانا۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"کسی شاعر کے کسی شعر میں یا مصرع یا قرآن کی کسی آیت یا حدیث کے کسی ٹکڑے کو اپنے کلام میں شامل کر لینے کا نام تضمین ہے۔"(۲۳)

ان کے کلام میں تضمین کی عمدہ مثالیں سامنے آتی ہیں۔ شاعر نے تضمین نگاری سے قاری کو گدگدانے کا پورا بندوبست اپنی مزاحیہ شاعری میں بارہا کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کا قطعہ بعنوان "ٹریفک سارجنٹ" قابلِ مطالعہ ہے جس میں آخری مصرع تضمین نگاری کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتا ہے:

صبح سے چوک پہ بیٹھا ہوں بڑا مندا ہے
کوئی مرغا جو پھنسے دل کو قرار آجائے
اک ہرا نوٹ مری جیب میں آئے ایسے
"جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے"(۲۴)

انھوں نے تضمین نگاری کے ذریعے اپنے کئی اشعار، غزلیات، نظموں اور قطعات میں مزاح پیدا کیا ہے۔ اپنے اشعار میں ڈاکٹر عمران ظفر نے مزاح پیدا کرنے کے لیے محاورات، کہاوتوں، روز مروں اور ضرب الامثال کا استعمال بھی شعری پیرائے میں سلیقے اور مہارت سے کیا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے شعری مجموعے بعنوان "شعر آیا شعر آیا" میں انھوں نے کئی محاورات اور کہاوتوں کو برتا ہے۔ ذیل میں نمونے کے طور پر مذکورہ غزل سے چند اشعار اہم ہیں:

ڈھول ہوں اور پھٹا ہوں تیرے کس کام کا ہوں
"میں کہ محروم نواہوں تیرے کس کام کا ہوں"
لوگ کہتے ہیں کہ ہوں موڈی پتنگا میں بھی
سر پھرا، نک چڑھا ہوں تیرے کس کام کا ہوں
میں کریلے کی طرح کڑوا کسیلا ہوں بہت
دوسرا نیم چڑھا ہوں تیرے کس کام کا ہوں(۲۵)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

درج بالا غزل کے اشعار میں محاورات اور ضرب الامثال کو مہارت سے بیان کیا گیا ہے جو شاعر کی زبان دانی اور لسانیات پر مکمل گرفت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف زبانوں کے الفاظ کو بھی بر محل استعمال کر کے شاعری میں مزاح پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مزاح نگاری کا ایک کارآمد حربہ زبان و بیان کی بازیگری ہے۔ ڈاکٹر عمران ظفر کے کلام میں لفظی بازیگری کی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ لفظی بازیگری سے مزاح پیدا کرنے کا سب سے پرانا طریقہ تکرار کو سمجھا جاتا ہے لیکم اس ضمن میں رعایتِ لفظی کو زمانہ قدیم سے ہی اہمیت حاصل ہے۔ رعایتِ لفظی کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"رعایتِ لفظی کا مقصد یہ ہے کہ لفظ کو اس انداز سے استعمال کیا جائے کہ ناظر کو اس لفظ کے دو مختلف مطالب کا احساس ہو۔"(۲۶)

ڈاکٹر عمران ظفر کی شاعری میں رعایتِ لفظی کے لیے ان کے بہت سے قطعات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ان کا ایک قطعہ بعنوان "شادی ہال میں" اس ضمن میں بطور مثال ملاحظہ ہو:

معززیں علاقہ بھی بن گئے وحشی
اشارہ جیسے ہوا جا کے کھانا کھانے کو
جو شادی ہال تھا بے حال ہوگیا پل میں
ذرا سی دیر میں کیا ہوگیا زمانے کو(۲۷)

مزاحیہ صورتِ واقعہ کو مزاح نگاری میں ایک اہم اور کامیاب حربے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے مزاح کے جو بنیادی محرکات پیش کیے ہیں ان میں مزاحیہ صورتِ واقعہ بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس حربے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مزاحیہ صورتِ واقعہ تین اہم عناصر کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ ——— ناہمواریوں کی اچانک پیدائش، الجھن میں اسیر انسان کے مقابلے میں ناظر کا احساسِ برتری اور یہ تسکین دہ احساس کہ اس واقعے میں صدمے یا دکھ کا پہلو موجود نہیں۔"(۲۸)

ڈاکٹر عمران ظفر کی شاعری میں اس حربے کا استعمال بہت ماہرانہ اور فنکارانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ ان کے بہت سے قطعات میں مزاحیہ صورتِ واقعہ کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان قطعات کو پڑھ کر قاری کو ہر گز یہ احساس نہیں ہوتا کہ زبردستی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، بلکہ ان کی شاعری میں فطری مزاح کا عکس واضح طور جھلکتا ہے۔ مزاحہ صورتِ واقعہ کی مثال ان کے قطعے میں ملاحظہ ہو:

محفل میں میرے سر سے جو کل وگ پھسل گئی
اتنے ہنسے وہ، اُن کی بتیسی نکل گئی
شوگر مجھے ہوئی تو میں کرتا تھا احتیاط
برفی کو دیکھ کر میری نیت بدل گئی(۲۹)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

کردار نگاری نے ہمیشہ سے ہی ادب میں اپنا منفرد مقام اور اپنی اہمیت منوائی ہے۔ نثر میں مزاحیہ کرداروں کی جابجا مثالیں ملتی ہیں ۔اس کے برعکس شاعری میں بہت کم شعرا نے اس کا تجربہ کیا ہے۔ بیسویں صدی میں اختر شیرانی، ن۔م راشد نے اپنی شاعری میں کردار تخلیق کیے۔ ڈاکٹر عمران ظفر نے بھی قدما کی تقلید کرتے ہوئے اپنی شاعری میں مختلف کردار تراشے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں مولوی، قصائی، ڈاکٹر، انکل سام (امریکہ) اور مختارے کے کرداروں کو لطیف انداز میں عمدگی سے پیش کیا ہے۔ اس تناظر میں ان کے کلام سے قطعہ بطور مثال ملاحظہ ہو:

انکل سام

مسلم کے بھی مرنے کا انھیں دکھ تو ہے لیکن
اپنوں کی ہلاکت ہو تو اندازِ فغاں اور
مقتول کی امداد کو دیتے ہیں ڈالر
"جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ 'ہاں' اور"(۳۰)

اگرچہ ان کی شاعری مختلف زبانوں کے الفاظ کے استعمال کی وجہ سے پھولوں کا ایک گلدستہ معلوم ہوتی ہے جس میں مختلف رنگوں اور مختلف خوشبوؤں کے حامل پھول موجود ہیں لیکن ان میں گلِ سرسبد کی حیثیت اردو کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر عمران ظفر کی مزاحیہ شاعری کا تحقیقی جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ عہدِ حاضر کے نامور اور اہم مزاح گو شاعر ہیں اور اردو مزاحیہ شاعری کی روایت کے تسلسل میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اصنافِ شاعری کو کمال مہارت اور سلیقے سے برتا ہے۔ مزاح نگاری کے حربوں میں سے تحریف اور تضمین نگاری ان کے سب سے زیادہ موثر اور کارگر ہتھیار ثابت ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر عمران ظفر نے ان حربوں کو جس کمال مہارت سے استعمال کیا ہے وہ ان کی فنّی چابکدستی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ آرین پور، یحیی، از صبا تا نیما، انتشارات کتابہای جیبی، تہران، ۱۳۵۵ش / ۱۹۷۶، ص ۳۵
۲۔ اشفاق احمد ورک، اردو نثر میں طنز و مزاح، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۲
۳۔ انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع سوم، ۲۰۱۲ء، ص ۱۷۴
۴۔ عمران ظفر، شعر آیا شعر آیا، کری ایٹو پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۳۹
۵۔ ایضاً، ص ۹۵
۶۔ ایضاً، ص ۹۹
۷۔ عمران ظفر، کرونا مرے آگے، کری ایٹو پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء، ص ۲۱
۸۔ ایضاً، ص ۲۸
۹۔ عمران ظفر، شعر آیا شعر آیا، ص ۱۰۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۹

۱۲۔ عمران ظفر، کرونا مرے آگے، ص ۱۲۶

۱۳۔ عمران ظفر، شعر آیا شعر آیا، ص ۱۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۱۹۔۱۱۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۸۸

۲۱۔ سلیم اختر، تنقیدی اصطلاحات: توضیحی لغت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۶۶

۲۲۔ عمران ظفر، کرونا مرے آگے، ص ۵۷۔۵۶

۲۳۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۴۷

۲۴۔ عمران ظفر، شعر آیا شعر آیا، ص ۲۲

۲۵۔ ایضاً، ص ۸۴

۲۶۔ وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، مکتبہ عالیہ، لاہور، گیارہویں بار، ۲۰۰۷ء، ص ۵۰

۲۷۔ عمران ظفر، شعر آیا شعر آیا، ص ۳۴

۲۸۔ وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، مکتبہ عالیہ، لاہور، گیارہویں بار، ۲۰۰۷ء، ص ۴۶

۲۹۔ عمران ظفر، شعر آیا شعر آیا، ص ۳۴

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۳

References in Roman Script:

1. Arian Pur, Yahya, Az Saba Ta nima, intsharat Kitab Haye Jibi, Tehran, 1976, P. 35
2. Ishfaq Ahmed Virk, Urdu Nasar me Tanzo Mizah, Bait ul Hikmat, Lahore, 2004, P. 22
3. Anwar Jamal, Adbi Isilahat, National book Foundation, Islamabad, 2012, P. 174
4. Imran Zafar, Sher Aya Sher Aya, Creative Publishers, Faisalabad 2019, Page 39
5. Ibid P. 95
6. Ibid P. 99

7. Imran Zafar, Corona Mery Agy, Creative Publishers, Faisalabad 2020, P. 21
8. Ibid P. 28
9. Imran Zafar, Sher Aya Sher Aya, P. 104
10. Ibid P. 23
11. Ibid P. 29
12. Imran Zafar, Corona Mery Agy, P. 126
13. Imran Zafar, Sher Aya Sher Aya, P. 19
14. Ibid P. 48
15. Ibid P. 118-119
16. Ibid P. 103
17. Ibid P. 31
18. Ibid P. 17
19. Ibid P. 25
20. Ibid P. 88
21. Saleem Akhtar, Tanqeedi Istilahat, Sang -e-Mel Publications, Lahore, 2011, P. 66
22. Imran Zafar, Corona Mery Agy, P. 57-56
23. Hafeez Siddiqui, Ab ul Ejaz, adbi Istilahat ka Taruf, asloob Lahore, 2015, page 147
24. Imran Zafar, Sher Aya Sher Aya, P. 22
25. Ibid P. 84
26. Wazeer Agha, Urdu Adab me Tanz o Mazah, Maktba Aalia, Lahore, 2007, P. 50
27. Imran Zafar, Sher Aya Sher Aya, P. 34
28. Wazir Agha, Urdu Adab me Tanz o Mazah, P. 46
29. Imran Zafar, Sher Aya Sher Aya, P. 34
30. Ibid P. 23

Dr. Ali Bayat is a distinguished Faulty Member in the Department of Urdu at the University of Tehran, Iran. Holding a Ph.D. in Urdu, his fields of interest encompass poetry and Urdu criticism. Dr. Bayat has made substantial contributions to Urdu literature, with 30 articles published in renowned Journals and 05 books, highlighting his expertise and dedication to advancing the study and appreciation of Urdu.

Mr. Aamir Bashir is a dedicated Research Scholar at Riphah International University's Faisalabad Campus, Pakistan. He holds M. Phil degree in Urdu and has a special interest in research and editing. Mr. Bashir has contributed to the field of Urdu literature, having published 06 articles and 01 book, underscoring his commitment to academic excellence and literary advancement.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 28th Feb, 2024 | Accepted: 11th June, 2024 | Available Online: 30th June, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i01.392

آزاد کشمیر کی اردو شاعری پر ادبی شخصیات کے اثرات: ایک مطالعہ

Influence of Literary Figures on Urdu Poetry of Azad Kashmir: A Study

DR. MUHAMMAD YOUSAF[1] AND DR. AMBREEN KHAWJA[2]

[1] Head, Department of Urdu, University of Azad Jammu & Kashmir, Muzaffarabad, Pakistan

[2] Assistant Professor, Department of Kashmir Study, University of Azad Jammu & Kashmir, Muzaffarabad, Pakistan

Corresponding author: Dr. Muhammad Yousaf (muhammad.yousaf@ajku.edu.pk)

ABSTRACT The study of the influence of literary figures on the poetry of Azad Kashmir shows that there are influences of Sanskrit, Kashmiri, Persian, Arabic, Urdu and other regional languages as well as classical and modern poetry on the literature of Azad Kashmir. There are intellectual and artistic influences on the poetry of Azad Kashmir from to the present period. Some thoughts are prominent, some artistic imitation is visible. There is similar style; there is also the use of similar tone. However, all these influences despite this, the poetry of Azad Kashmir has its own individuality and its own style. Azad Kashmir's poetic capital, while being a part of the poetic tradition of Urdu language, has interesting, unique experiences and individual characteristics in terms of theme, theme, style innovation, new symbols, techniques, untouched and unique creative experiences and many other aspects. Azad Kashmir's own regional symbols and some unique experiences give its distinctive color to the poets of Azad Kashmir. Happily, the influence of movements, ideologies and personalities in the footsteps is less visible in the new generation. The poets of the new generation are actively and diligently engaged in creating their own special point of view, their own tone, their own style, and their own color. In spite of the influence of literary movements, critical schools, literary theories, poetic styles and poet personalities in the poetry of Azad Kashmir, its own color and harmony exist with all the beauty, rather, the colors and styles of the poets of Azad Kashmir are different from those of many other regions.

Keywords literary, regional symbols, distinctive, ideologies, poetic, styles, style innovation, symbols, techniques, distinctive.

کسی بھی ادب کو پروان چڑھانے اور فروغ دینے میں ادبی شخصیات کا کردار کارفرما ہوتا ہے جو اس کو اوج کمال کی بلندیوں تک پہنچا تے ہیں۔ اردو زبان و ادب میں کئی ایسے با اثر شعرا گزرے ہیں جن کا نام کئی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی زندہ ہے۔ یہی وہ شخصیات ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب کو مالا مال کیا اور اسے بین الاقوامی زبان بنایا۔ آج ان کی تقلید کے ساتھ ساتھ ان کی طرز، ان کی فکر و فن پر شاعری کی جارہی ہے۔ آیا وہ کون سی شخصیات ہیں جن سے ہمارے شعرا کرام متاثر ہوئے؟ ان کا اسلوب کیسا تھا؟ ان کی فکر کیا

This work *is licensed under a* Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

تھی؟ وہ کس طرح کی زمینوں میں لکھتے تھے؟۔ آج بھی غالب، علامہ اقبال، فیض احمد فیض، مومن خان مومن، میر درد، میر تقی میر اور جوش، کے علاوہ کئی کلاسیک وجدید شعرا کے اسلوب کو اپنایا جارہا ہے۔ آزاد کشمیر کے شعرا نے بھی ان کے اثرات کو قبول کیا۔ کسی شاعر نے ان شعرا کا سا اسلوب اپنایا تو کسی نے ان کی فکر کو اپنایا اور کسی نے فنی تقلید کی۔ آزاد کشمیر کے ادب پر ادبی تحریکوں، تنقیدی دبستانوں، ادبی نظریات، شعری اسالیب اور شاعر شخصیات کے اثرات کن کن شعرا پر کہاں کہاں اور کس کس صورت میں پڑتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر افتخار مغل لکھتے ہیں:

> "آزاد کشمیر کے شعرا پر مختلف قسم کے رویوں اور شخصیات کے ملے جلے اثرات ہیں۔ پہلے دور کے شعرا میں سے امین طارق قاسمی، یعقوب شائق، بشیر مغل اور کچھ دیگر پر تحریک ادب اسلامی کے اثرات نمایاں ہیں۔ چراغ حسن حسرت پر چار غزل گو شعرا داغ، اصغر گونڈی، فانی بدایونی اور حسرت موہانی کے ملے جلے اثرات ہیں۔ عماد الدین سوز غالب کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ اکرم طاہر اپنے مضامین میں اقبال کے ہم نوا ہیں۔ طالب گور گانی جگر اور یگانہ سے متاثر ہیں۔ موزوں سرمدی علامہ سیماب اکبر آبادی کے مداح ہیں۔ محمد خان نشتر پر داغ کی معاملہ بندی کا اثر نمایاں ہے۔ آزر عسکری اپنے بعض قرینوں میں اکبر الہ آبادی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ عبد الغنی غنی، وحید چراغ، انجم خیالی اور تحسین جعفری پر کسی شاعر یا تحریک کا اثر واضح طور پر نظر نہیں آتا۔ الطاف قریشی، منیر نیازی سے بے حد متاثر ہیں۔ منور قریشی پر ظفر اقبال، سلیم احمد، افتخار، جالب اور انیس ناگی کے ملے جلے اثرات کا پتا چلتا ہے۔ عبد الرزاق بیکل اور صابر آفاقی غالب کے رنگ کلام کے گرویدہ ہیں۔ زاہد کلیم پر جوش کے اثرات ہیں۔ اسلم راجا بہ یک وقت ساحر، فیض، محسن بھوپالی، ابن انشاء اور اختر شیرانی کے اثر میں ہیں۔ بلبل کاشمیری پر اختر شیرانی کے اثرات ہیں۔ نذیر انجم پر ترقی پسند شعرا کے اثرات ہیں۔ مقصود جعفری پر بہ یک وقت ساغر صدیقی اور ساحر لدھیانوی کے اثرات نمایاں ہیں۔ مظفر احمد ظفر اور زید اللہ فہیم میر اور درد کے ہم نوا نظر آتے ہیں۔ نصیر احمد ناصر پر انیس ناگی، بشیر سیفی اور علی محمد فرشی کے اثرات ہیں۔ ایم یامین کو منیر نیازی کی روایت کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ توصیف خواجا پر راشد اور اختر حسین جعفری کے اثرات محسوس ہوتے ہیں۔ اسرار ایوب کی نظم 'فرض کرو'، اعزاز احمد آزر کی اسی عنوان اسی مضمون اور اسی عروضی آہنگ میں لکھی گئی نظم کے زیر اثر نظر آتی ہے۔ رفیق بھٹی کی نظم 'ماضی، حال اور مستقبل' کا ماحول اور لفظیات براہ راست فیض سے متاثرہ ہیں۔ رفیق بھٹی کی نظمیں 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ'، اقبال کی نظموں 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' کے براہ راست اثر میں ہیں۔ احمد عطا اللہ سیف الدین سیف کا رنگ لیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مخلص وجدانی ظفر اقبال، سبط علی صباء اور علی مظہر / شعر کے ہم رنگ ہونے کے باوجود اپنا ذاتی رنگ رکھتے ہیں۔ شاعرات میں پروین شاکر کا لہجہ بہت مقبول ہے تاہم یہاں کی شاعرات میں آمنہ بہار کا لہجہ منفرد ہے۔ نوجوان شعرا میں ظفر اقبال اور سلیم احمد کی ریڈیکل جدیدیت کا رنگ مقبول ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

علاوہ ازیں یہ نسل فراز اور منیر نیازی سے بھی متاثر ہے ۔آزاد کشمیر کے شعرا میں آزاد کشمیر کے سینیئر شاعروں کا اثر ہے بھی موجود ہے۔"(۱)

ذیل میں چند ان شعرا کا تذکرہ کیا جائے گا جنھوں نے بڑی ادبی شخصیات کے اثرات کو قبول کیا۔ آزاد کشمیر کے شعرا نے مختلف شعرا کی زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی نے غالب (ردیف الف) کی غزلیات کی زمینوں میں ایک پورا مجموعہ تحریر کیا ہے، ڈاکٹر صابر آفاقی کی غزل کا یہ ذیل شعر غالب کی زمین، کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر' ملاحظہ کیجیے دونوں اشعار میں فکری اور فنی مماثلت موجود ہے:

صابرؔ جو اس کی تیغ ادا کا شہید ہے
ڈرتا نہیں ہے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر(۲)

اسی طرح ڈاکٹر عمادالدین سوز کا شعر غالب کی زمین، سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں' میں قافیہ اور ردیف کی یکسانیت ملاحظہ کیجیے۔ غالب کی زمین، 'دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے' میں منور قریشی کا یہ ذیل شعر دیکھئے۔ زید اللہ فہیم کی غزل کا اسلوب اور شعر غالب کی زمین، ابن مریم ہوا کرے کوئی' تمام اشعار میں فکری وفنی مماثلت پائی جاتی ہے:

حسرتیں ساری یکایک دل میں پنہاں ہو گئیں
بن کے سیلاب آنسو ، آہیں اور طوفاں ہو گئیں(۳)

پہلے کیا تھا مرا وہاں کیا ہے؟
ان سے ملنے کا مدعا کیا ہے؟(۴)

دل کی باتیں سنا کرے کوئی
زخم دل کو سیا کرے کوئی(۵)

عبد الرزاق بے کل کی غزل کا شعر اور غالب کی زمین، ناوک انداز جدھر دیدہ جاناں ہوں گے' میں یکسانیت موجود ہے، غالب کا رنگ، ترے وعدے پہ جیے ہم یہ جان جھوٹ جانا اور تمام رات قیامت کا انتظار کیا کا اثر عاصی کاشمیری ملاحظہ ہو، مخلص وجدانی کے شعر پہ غالب کا رنگ کے ساتھ ساتھ دونوں شعرا کے لیے انتظار کی گھڑیاں مشکل ہیں:

دل جگر خاک ہیں کل خاک پریشاں ہوں گے
اور ہوں گے کہ ترے پیار کے شایاں ہوں گے(۶)

وعدے پہ اعتبار بڑی دیر تک رہا
کل تیرا انتظار بڑی دیر تک رہا(۷)

ذرا دیکھ تو مڑ کے جان تمنا
تری راہ میں ہم ہیں آنکھیں بچھائے(۸)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

بے کل اور حر کا شمیری کے اشعار غالب کے 'ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا' اور ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب' رنگ میں ملاحظہ کیجیے: جہاں غالب کو خدا کی یکتائی دکھائی دے رہی ہے وہاں حر کو بھی نہاں اور عیاں ہر طرف خدا کی واحدنیت نظر آ رہی ہے:

نہاں ہوتا تو کیا ہوتا ،عیاں ہوتا تو کیا ہوتا
جہاں میں تو ہی تو ، تیرا نشاں ہوتا تو کیا ہوتا(۹)
زمین پر بیٹھے بیٹھے قدم جب عرض پر رکھیں؟
خداوند کہاں پہنچیں جو رکھیں ہر قدم اتنا(۱۰)
پاتا میں سو جنم اگر تجھ پہ نثار ہوتا
دیوانہ وار ہوتا اور بار بار ہوتا(۱۱)

اسرار ایوب پر مرزا غالب کے اثرات ہیں انھوں نے غالب کی زمین 'آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک، کے رنگ میں بہ ذیل اشعار لکھے ہیں۔ دونوں شعرا نے ایک ہی خیال کو ایک زمیں میں بیان کر کے فکری و فنی مماثلت قائم کی ہے:

منجمد رات جدائی کی بشر ہونے تک
راکھ ہو کر تجھے دیکھا ہے شرر ہونے تک
میں ہوں اسرار مری جان میں غالب تو نہیں
کیسے مر جاؤں تری زلف کے سر ہونے تک (۱۲)

ناز مظفر آبادی، ڈاکٹر آمنہ بہار اور زید اللہ فہیم کے اشعار غالب 'دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے' قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں' بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے' کے رنگ اور زمینوں میں ملاحظہ کیجیے۔ اشعار میں ایک ہی مفہوم اور خیال کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے:

پوچھتے ہو کہ مدعا کیا ہے
کہنے سننے کو اب رہا کیا ہے(۱۳)
دل کے بہلانے کو یونہی ایک نامہ لکھ دیا
جو جواب آئے گا ان کا، وہ مجھے معلوم ہے(۱۴)
یہ غم دیمک کی صورت لگ گیا ہے دل کے پودے کو
اجل کس موڑ پر جانے بہ تمہید عدم نکلے(۱۵)

محمد ابراہیم گل اور اکرم سہیل پر غالب کے شعر 'ابن مریم ہوا کرے کوئی' کے اثرات موجود ہیں۔ اشعار میں فکری اور فنی مماثلت موجود ہے:

جس دنیا میں جینا ہی چند روز ہو

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ایسی دنیا کا کیا کرے کوئی(۱۶)
آنکھ سے بھی کہا کرے کوئی
دل کی بھی سنا کرے کوئی(۱۷)

میر کے مضامین 'اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا' لو ہو آتا ہے جب نہیں آتا' اور کاش اٹھیں ہم بھی گنہ گاروں کے بیچ، کے زید اللہ فہیم اور واحد اعجاز میر کے اشعار پر اثرات دیکھیے۔ خواجا میر درد کے رنگ میں مظفر احمد مظفر اور احمد عطااللہ کے اشعار ملاحظہ کیجیے کہ اشعار میں ایک خیال کو مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے:

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
دل جو پتھر ہو تب نہیں آتا(۱۸)
اپنی چھت اور اپنی دیوروں کے بیچ
آج بھی انسان ہے غاروں کے بیچ(۱۹)
جل بجھے آہ کتنے پروانے
کیا کہا شمع نے خدا جانے (۲۰)
پیار ہونے پہ کیسی حیرانی
عین ممکن ہے ہو گیا ہو گا(۲۱)

اکرم طاہر، اسرار ایوب اور ملک ابراہیم کی شاعری پر اقبال کا اثرات، تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں، یہ فریب خوردہ شاہیں اور اے طاہر لاہوتی' اور ملک محمد ابراہیم کے ہاں اقبال کی فکر کا بہت گہرا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شاید میں وہ شاہین ہوں
تلاش رزق طاہر جس کو لے آئی ہے زاغوں میں(۲۲)
فریب گاہ خرد سے تو وہ جنوں اچھا
کہ جس کو فلسفہ و عقل کی نہیں پرواہ (۲۳)
اب فقط باتیں ہی باتیں باقی ہیں کہاں لالہ و گل
یہ بھی گلشن تھا کبھی جو ویرانہ ہو(۲۴)

محمد خان نشتر کی شاعری پر علامہ اقبال کے گہرے اثرات موجود ہیں۔ انھوں نے اقبال کے مصرعوں پر تضمین بھی کی ہے۔ فکری اور فنی اعتبار سے دونوں شعرا کے ہاں یکسانیت پائی جاتی ہے:

ملی ہے سالہ مزاجوں کو گل رخوں کی کتاب
مذاق کم نظری ہو گیا ہے جلوہ ماہ آب

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

خزاں میں ذکر بہاراں ہوا ہے اب کہ عذاب
نہ مے نہ شعر نہ ساقی نہ شعور چنگ و رباب(۲۵)

خواجہ محمد عارف کی شاعری پر اقبال کے افکار کے گہرے اثرات موجود ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر اشعار قبال کی بحروں اور زمینوں میں کہے ہیں۔ خودی کا سر نہاں، لا الہ الا اللہ، خودی ہے تیغ، فساں لا الہ الا اللہ اور خواجا محمد عارف کا کلام جو علامہ کے تتبع اور ان کی زمین میں کہی ہے۔

بنائے کون ومکاں ،لا الہ الا اللہ
نظام کار جہاں ،لا الہ الا اللہ(۲۶)

ڈاکٹر سردار فیاض الحسن پروفیسر عبدالحق مراد پر اقبال کے اثرات موجود ہیں۔ نہ تو زمین کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے، جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے اور ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن' ملاحظہ کیجیے:

مکہ کی گلیوں کی خاک شفا ڈال لو آنکھوں میں روشنی کے لیے
کچھ تو زاد سفر ساتھ ہو آپ کے اس جہاں میں وہاں کی خوشی کے لیے(۲۷)
ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان ،نئی آن
ہے آج باز جو ہوتا تھا شتر بان(۲۸)
وہی لوگ اقبال کو ہیں پسند
"ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند"(۲۹)

اقبال کی نظم 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' کے اشعار کے بصیر تاج کے اشعار پر اثرات ملاحظہ کیجیے: میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب، میں نے توڑا مسجد ودیر وکلیسا کا فسوں، اور اب بصیر تاجور کا شعر ملاحظہ کیجیے:

جس نے آقا اور غلاموں کو برابر کر دیا
جس "نے توڑا مسجد ودیر وکلیسا کا فسوں"(۳۰)

اقبال کا شعر ملاحظہ کیجیے: تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی، کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارہ، مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی، کہ دیکھیں جن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ" اور وقار احمد میر کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

"تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی"
کہ وہ گفتار تو رفتار وہ ثابت تو آوارا
مگر وہ حسن کے موتی جو ہر ساحل پہ بکھرے ہیں
"کہ دیکھیں جن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ"(۳۱)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

زاہد کلیم پر جوش کے زیادہ اثرات موجود ہیں۔ماضی کی سمت ہنس کے اشارانہ کیجیے،اب ذکر آب ورنگ تمنانہ کیجیے،اسی طرح منور قریشی کے بہ ذیل کے شعر 'وطن کے جاں نثار ہیں وطن کے کام آئیں گے'میں بھی جوش کا سا انداز موجود ہے:جوش کے اس مضمون 'نام ہے میرا تغیر نام ہے میرا ثبات،میرا نعرہ انقلاب وانقلاب وانقلاب'میں ڈاکٹر نثار ہمدانی کی شاعری ملاحظہ کیجیے:

دل میں لگا کے آگ نظار نہ کیجیے
اس طرح ظلم ہم پہ خدا را نہ کیجیے(۳۲)
اب اپنے گلستان کو ہم آپ سنواریں گے دھرتی کو نکھاریں گے
یہ اپنا چمن ہم سے جان مانگے تو واریں گے ہمت نہیں ہاریں گے(۳۳)
کہاں کہاں سے دباؤ گے کیسے روکو گے؟
میں انقلاب ہوں سینوں سے پھوٹ آوں گا (۳۴)

سلیم احمد کی زمین 'میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں'میں احمد عطاء اللہ، مخلص وجدانی،ڈاکٹر افتخار مغل، فرزانہ فرح ،ابراہیم گل، علی عارفین اور شاہد بہار، کے اشعار ملاحظہ کیجیے۔ سلیم احمد کی فکر اور فن میں ان اشعار میں کتنی یکسانیت موجود ہے:

کہ تکیے کی جگہ رکھتا ہوں میں ماں کی دعاؤں کو
اندھیری رات ہے اپنے لیے بستر بناتا ہوں(۳۵)
تری برسات کے بادل گزر جاتے ہیں بن برسے
تمنا کی زمینوں کو اگر ہو تر، بناتا ہوں(۳۶)
غزل کی چوڑیاں اور نظم کی جھانجھر بناتا ہوں
میں سونے جیسے شعروں سے ترے زیور بناتا ہوں(۳۷)
کبھی بندا ، کبھی پائل ، کبھی جھانجھر بناتی ہوں
میں تنہائی کے لمحوں میں تجھے زیور بناتی ہوں(۳۸)
نمک پارے ، دھی بلے ، پکوڑے ، نان چھولے ، سب
بناتے ہوں ، مگر تھوڑے میں بہتر بناتا ہوں؟؟(۳۹)
خدا نے اس لیے شائد مصور کر دیا مجھ کو
حسیں چیزوں کو ان کے حسن سے بہتر بناتا ہوں(۴۰)
مرے ہمراہ چلنا اس قدر آساں نہیں ہوتا
پلٹ کر دیکھنے والوں کو میں پتھر بناتا ہوں(۴۱)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ساغر صدیقی کی زمین: 'مر بھی گئے تو چادر صحرا بری نہیں' میں ڈاکٹر مقصود جعفری کا انداز دیکھیے۔ شہزادی عظمیٰ کا شعر فراز کی زمین، سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

تاروں کی ضو میں خواہش بینا بری نہیں
دو چار گھونٹ مے کی تمنا بری نہیں
اک رند کہ رہا تھا سربزم مے کشاں
میں ہی برا ہوں دوستو دنیا بری نہیں(۴۲)
ہماری بات پر ان کو یقیں نہیں ہوتا
ہماری ذات کو افراد گھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے آئینہ سچائی کی علامت ہے
اب آگئے ہیں ذرا بن سنور کے دیکھتے ہیں(۴۳)

فرحت عباس شاہ کی زمین 'تو کسی روز مرے گھر میں اتر شام کے بعد' میں فرزانہ فرح، اعجاز نعمانی اور علی عارفین کی طبع آزمائی دیکھیے:

روشنی میں تو سمٹ جاتے ہیں سارے منظر
کس قدر پھیل گیا دشت نظر شام کے بعد(۴۴)
اپنے اشعار کی تکذیب بھلا کیسے کروں
میں جنہیں کہتا ہوں بادید ہ تر شام کے بعد((۴۵)
مجھ کو بازار میں یوں ہاتھ دکھانے والے
تو کبھی میرے محلے سے گزر شام کے بعد(۴۶)

مجید امجد کی زمین ، بنے یہ زہر بھی شفا جو تو چاہے 'میں فرزانہ فرح ،اعجاز نعمانی، شاہد بہار، علی عارفین کی شاعری ملاحظہ کیجیے:

بس اک دیا ہے دعا کا جلا دیا ہے جسے
قبول کر لے اسے اے خدا جو تو چاہے (۴۷)
میں تجھ کو مانگ لوں اپنے خدا سے بھی اک دن
مری ہتھیلی پہ رکھی دعا جو تو چاہے(۴۸)
یہ اور بات کہ ہم فتیاب ہیں ،لیکن
تجھی پہ چھوڑ دیا فیصلہ ، جو تو چاہے(۴۹)
ہو ا کے رخ کو بڑی دیر میں میں سمجھا ہوں
یہ اعتبار کرے راستہ جو تو چاہے(۵۰)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ساغر صدیقی 'چراغ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے' میں امین طارق قاسمی کا شعر ملاحظہ کیجیے، ساقی فاروقی کی نظم 'زندہ پانی سچا' کا موضوعی اثر! ایم یامین کے ہاں ملاحظہ ہو:

محیط برسر مقتل ہے تیغ خوں آشام
یہ تیغ دست ہٹاؤ، بڑا اندھیرا ہے(۵۱)

سندر ڈل کا شیتل جل
میرے شہر کا سینہ کھول کے نکلا تھا
اس کی لہریں زندہ سچی لہریں(۵۲)

ن۔ م۔ راشد جیسے کسی شہر مدفون پر وقت گزرے کا ایم یامین پر اثر دیکھیے۔ فیض کے مضمون، بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی کا مصنف بھی، کا موضوعی اثر عاصی کاشمیری کے ہاں موجود ہے ملاحظہ کیجیے:

تین اور ساٹھ سفر کی راتیں
جیسے دشمن فوج کسی بستی سے گزرے(۵۳)

مدعی بھی وہی اور عدالت اس کی
مدعی بھی وہی اور عدالت اس کی(۵۴)

نذیر انجم کے اشعار پر فیض کا رنگ موجود ہے۔ 'داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر اور نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں اور بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی، کسے وکیل کریں کس سے منصف چاہیں دیکھیے:

یہ داغ دار سحر ، یہ خزاں گزیدہ بہار
مرے چمن ! میں تری زخم خوردگی کے نثار(۵۵)

دست قاتل میں میزان انصاف ہے
اب کدھر جائیں ہم منصفی کے لیے(۵۶)

عطا کا شعر دیکھیے جس میں پروین شاکر کے شعر 'کار جہاں ہمیں بھی تھے سفر کی شام، اس نے بھی التفات زیادہ نہیں کیا' کا عطا کے شعر پر نمایاں اثر موجود ہے، ڈاکٹر نثار ہمدانی پر پروین شاکر کا اثر ان کے ذیل کے شعر میں دیکھیے:

عشق ہے کار مسلسل، ورنہ
کام تھے ہم کو بھی دیگر کیا کیا(۵۷)

پری نہیں ہو کوئی تم نہ میں شہنشہ ہوں
خیال و خواب سے نکلو تو مجھ سے بات کرو(۵۸)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ڈاکٹر مقصود جعفری کے شعر پر فیض کے مضمون، ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال و منال کا پوچھتے ہو! کا اثر ملاحظہ کیجیے: بشیر صرفی اور الطاف قریشی پر منیر نیازی کا گہرا اثر ہے۔ بشیر صرفی نے تو کتاب کا نام ہی 'اشک رواں کی نہر' رکھا جو منیر کے مصرعے کے ماخوذ ہے:

کیا خستہ دلوں سے کرتے ہو تم جعفری قصہ سود و زیاں
اب خون کے بہتے دریا سے یہ کاسہ جاں لبریز کرو[۵۹]

جو اندر باہر سے طیب
جس کے سانس غازی
داتا[۶۰]

انور مسعود کے مضمون کا فیضان مرزا پر اثر ہے اور اختر حسین جعفری کے شعر 'تو جدا ایسے موسموں میں ہوا، جب درختوں کے ہاتھ خالی تھے' کا ظافر گیلانی کی شاعری پر اثر دیکھیے:

میں جرم خموشی کی صفائی نہیں دیتا
ظالم اسے کہیے جو دہائی نہیں دیتا
تو قوم کا مجرم ہے کبھی خود بھی ذرا سوچ
کیوں ظلم مسلسل پہ دہائی نہیں دیتا[۶۱]

تجھ کو ظافر آج ہی میں کیا دوں تحفے میں
پت جھڑ موسم خالی ہاتھ درختوں کے[۶۲]

ذہین شاہ تاجی کے شعر 'کیا پیش کروں تم کو کیا چیز ہماری ہے، یہ دل بھی تمھارا ہے یہ جاں بھی تمھاری ہے' کا پروفیسر شفیق راجا کی شاعری پر کس حد تک فکری و فنی چھاپ ملاحظہ کیجیے:

دل جگر پیش کروں سود و زیاں پیش کروں
ان کی رحمت کے حضور اشک رواں پیش کروں[۶۳]

دلشاد اریب کا انداز عبدالمجید کے شعر 'کتنی محبوب تھی زندگی کچھ نہیں کچھ نہیں، کیا خبر تھی اس انجام کی کچھ نہیں کچھ نہیں' کا دلشاد اریب کے شعر پر اثر ملاحظہ کیجیے:

اس زندگی کے سارے فسانے میں کچھ نہیں
سچ ہے تمھارے بعد زمانے میں کچھ نہیں[۶۴]

احمد فراز کا یہ 'جس کو سب بے وفا سمجھتے ہوں، بے وفائی اسی سے مشکل ہے' دیکھیے اور پھر بشیر چغتائی کا شعر ملاحظہ کیجیے کس قدر مماثلت موجود ہے۔

ملبے کا جو ڈھیر ہوا چند لمحوں میں

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

اب کا ویسا شہر بسانا مشکل ہے(۶۵)

بشارت کاظمی پر زبیر صغیر اور راز آلہ آبادی کے ان مضامین 'سمجھ سکو تو سمجھ لو ہماری آنکھوں کو، اب اور ہم سے وضاحت تو ہو نہیں سکتی' اور یہی بہت ہے کہ تم دیکھتے ہو ساحل سے، سفینہ ڈوب رہا ہے تو کوئی بات نہیں' کے اثرات دیکھیے:

اس سے ملنے کی تمنا مگر کیا کیجیے
وقت سے قیامت بھی ہو نہیں سکتی(۶۶)

تیری نسبت سے ملے ہیں کئی ہم درد مجھے
کیا ہوا تو نہ ملا یار کوئی بات نہیں(۶۷)

الطاف عاطف پر فیض احمد فیض کے اثرات کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ فیض احمد فیض کے اس شعر 'زندگی کیا مفلسی کی قبا ہے جس میں، ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں اور الطاف عاطف کا بہ ذیل شعر دیکھیے کہ زندگی کے بارے میں دونوں کا انداز بیان کتنی مماثلت رکھتا ہے۔ غور کیجیے:

زندگی یوں گزر گئی پر نم
جیسے گزری بہار پر نم
غم کے صحرا میں زندگی اپنی
میں نے بھی تو گزار دی پر نم(۶۸)

یگانہ چنگیزی کا شعر دیکھیے: کیوں کسی سے وفا کرے کوئی، دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی اور محمد ابراہیم گل کا شعر یگانہ کی زمین میں دیکھیے:

جس دنیا میں جینا ہی چند روز ہو
ایسی دنیا کا کیا کرے کوئی (۶۹)

امیر مینائی کا شعر دیکھیے، آنکھیں کیوں دکھاتے ہو، جون بھی دکھاؤ صاحب، وہ الگ باندھ کے رکھا جو مال اچھا ہے، اور اب اکرم سہیل کا شعر ملاحظہ کیجیے:

کوئی بھی چور چرا لے گا یہ خیال رہے
الگ سے باندھ کے تم نے جو مال رکھا ہے(۷۰)

احمد ندیم قاسمی کی شاعری 'برف کے پگھلنے میں، پو پھٹے کا وقفہ ہے، اس کے بعد سورج کو، کون روک سکتا ہے، اور صحبت کا احمد عطاء اللہ پر کافی اثر ہے۔

برف زاروں سے کتنے ہی موسم سہانے گئے شہر کو
ہم تو ڈھلوان پر پانیوں کو عطا روکتے رہ گئے(۷۱)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

جون ایلیا کے شعر 'مستی حال کبھی تھی، کہ نہ تھی، بھول گئے، یار اپنی کوئی حالت نہ رہی، بھول گئے، اور محمد خان نشتر کے درج ذیل شعر میں مماثلت ملاحظہ کیجیے:

کچھ لوگ کہ پیمان وفا بھول گئے
پیمان وفا صدق و صفا بھول گئے(۷۲)

ساغر صدیقی کی غزل کی زمین میں لکھا۔ ساغر صدیقی کا شعر 'جس دور میں لٹ جائے غریبوں کی کمائی اس دور کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے، اور حسرت موہانی کا شعر 'رسم جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے، خب وطن مست خواب دیکھئے کب تک رہے، اور امین طارق قاسمی کے اشعار میں ملاحظہ کیجیے:

اس دور کا منشور ہے سلطانی جمہور
شاہوں کے شناخواں سے کچھ بھول ہوئی ہے(۷۳)
حسرت فضل بہار دیکھئے کب تک رہے
پہلوئے گل میں یہ جار دیکھئے کب تک رہے(۷۴)

منور احمد قریشی کی شاعری پر بھی فیض احمد فیض کے اثرات نظر آتے ہیں۔ جس طرح فیض عوام میں انقلاب کی لہر دوڑاتے ہیں۔ لوگوں میں اجوت کے جذبے کو پروان چڑھاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی انداز ہمیں منور احمد قریشی کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔۔ ان کا نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

بچے مزدوروں کے اسکول بھی جائیں گے کچھ سیکھ کے آئیں گے
بنیاد نئے کل کی ہم آج اٹھائیں گے تقدیر بنائیں گے
تقدیر بنائیں گے ہم بھاگ جگائیں گے ہم ہمت نہیں ہاریں گے
بیٹے دہقانوں کے دھرتی کا مقدر ہیں کرنوں کے پیمبر ہیں(۷۵)

کاشف رفیق کی شاعری پر نصیر ترابی کا رنگ نظر آتا ہے۔ کبھی تو یہ ان کی فکر کو لے کر آگے چلتے ہیں تو کبھی ان کا سا انداز بیاں، نصیر ترابی کا شعر 'عداوتیں تھیں، تغافل تھا، رنجشیں تھیں بہت، بچھڑنے والے میں سب کچھ تھا، بے وفائی نہ تھی' اور ڈاکٹر کاشف رفیق کا شعر ملاحظہ کیجیے:

کیا دور تھا ہم بھی تھے آزاد و خود نگر
تب اپنی زیست غیروں کے زیر اثر نہ تھی(۷۶)

جون ایلیا کا شعر پیش ہے 'ہو کا عالم ہے یہاں نالہ گروں کے ہوتے، شہر خاموش ہے شوریدہ سروں کے ہوتے، اسی زمین میں واحد اعجاز میر کا شعر ملاحظہ کیجیے:

شہر ویراں تیرے دربدروں کے ہوتے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

اتنی بے رنگ فضا خواب گروں کے ہوتے(۷۷)

احمد ندیم قاسمی کا شعر ہے 'تجھے کھو کر بھی تجھے پاوں جہاں تک دیکھوں، حسن یزداں سے تجھے حسن بتاں تک دیکھوں اور وقار احمد میر کا شعر ہے:

معجزہ ہے کہ مرا حسن تخیل ہے وقار
تو ہی آتا ہے نظر مجھ کو جہاں تک دیکھوں(۷۸)

حر کاشمیری کی شاعری پر منیر نیازی، ڈاکٹر افتخار عارف اور جلیل مانک پوری کے اثرات واضح طور پر دکھائی دے رہے ہیں۔ جلیل مانک پوری کے شعر 'بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی، کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی، رانا سعید دوشی کے شعر 'کیوں کرتا ہے کم ظرفوں سے تو تکرار سمندر، جیسے گزرے خاموشی سے وقت گزار سمندر، اور ڈاکٹر افتخار عارف کے شعر 'شہر گل کے خس وخاشاک سے خوف آتا ہے، جس کا وارث ہوں اسی خاک سے خوف آتا ہے، نہ تھا، کے اثرات ملاحظہ کیجیے:

جاں سے بلائے جان یہ ٹالی نہ جائے گی
قد سے بڑی کلاہ سنبھالی نہ جائے گی(۷۹)
ویری ناگ کی موج پہ قربان یہ تیری رفتا ر سمندر
کوثر ناگ کی بوند پہ واروں تجھ کو لاکھوں بار سمندر(۸۰)
نہیں ہے یوں فقط دار سے خوف آتا ہے
مسند و معصب دربار سے خوف آتا ہے(۸۱)

غالب کی زمین میں جاوید الحسن جاوید کے درج ذیل اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ فکری اعتبار سے جاوید الحسن جاوید کے یہ اشعار نعتیہ ہیں لیکن غالب کی زمین میں یہ اشعار لکھے گئے ہیں:

وہ میر کارواں ہوتے میں گرد کارواں ہوتا
جہاں ہوتے مرے آقا ﷺ وہیں ہوتا وہاں ہوتا(۸۲)
ابھی تو طفل مکتب بھی نہیں میں نعت گوئی میں
نبی ﷺ جی نعت کہنے کے مرے ارماں کہاں نکلے(۸۳)

آزاد کشمیر کی شاعری پر ادبی شخصیات کے اثرات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کشمیر کے ادب پر سنسکرت، کشمیری، فارسی، عربی، اردو اور دیگر علاقائی زبانوں کے اثرات کے ساتھ ساتھ کلاسیک و جدید شعرا کے اثرات موجود ہیں۔ ابتدا سے لے کر موجود دور تک آزاد کشمیر کی شاعری پر فکری اور فنی اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں فکر نمایاں ہے، کہیں فنی تقلید دکھائی دیتی ہے۔ ایک جیسی زمینیں موجود ہیں، ایک جیسی بحروں کا بھی استعمال موجود ہے۔ تاہم ان تمام اثرات کے باوجود آزاد کشمیر کی شاعری میں اپنی انفرادیت اور اپنا اسلوب بھی موجود ہے۔ آزاد کشمیر کا شعری سرمایہ اردو زبان کی شعری روایت کا حصہ ہوتے ہوئے بھی موضوع، ہئیت، اسلوب کی

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

اختراع پسندی، نئی علامت سازی، تراکیب سازی، اچھوتے اور منفرد تخلیقی تجربات اور دیگر متعدد پہلوؤں سے دل چسپ، منفرد تجربات اور انفرادی خدوخال کا حامل ہے۔ آزاد کشمیر کی اپنی علاقائی علامتیں اور بعض منفرد تجربات آزاد کشمیر کے شعرا کو اپنا مخصوص رنگ عطا کرتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ تحریکوں، نظریات اور شخصیات کی جو اثر پذیری قدما میں ہے، وہ نئی نسل میں بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ نئی نسل کے شعرا اپنا خاص نقطہ نظر، اپنا لب ولہجہ، اپنا انداز، اپنا اسلوب اور اپنا رنگ بنانے کے لیے سرگرمی اور مستعدی سے مصروف ہیں۔ آزاد کشمیر کی شاعری میں ادبی تحریکوں، تنقیدی دبستانوں، ادبی نظریات، شعری اسالیب اور شاعر شخصیات کے اثرات کے باوجود اپنا رنگ وآہنگ تمام تر خوب صورتی کے ساتھ موجود ہے، بل کہ آزاد کشمیر کے شعرا کے رنگ اور اسلوب کو کئی دیگر علاقوں کے شعرا اپنا رہے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، کشمیر میں اردو شاعری، مقالہ برائے ایم۔فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۱۹۹۵ء ص ۱۲۳
۲۔ صابر آفاقی، شہر تمنا، آئینہ ادب چوک مینار انار کلی لاہور، ۱۹۸۰ء، ص ۲۳
۳۔ عمادالدین، ڈاکٹر، غیر مطبوعہ کلام
۴۔ منور احمد قریشی، دلیز شب، ٹی بی ایم پبلشرز اینڈ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۲
۵۔ زید اللہ فہیم، غیر مطبوعہ کلام
۶۔ عبدالرزاق بے کل، ہنگام جنوں، الفلاح پبلشرز۔ پشاور ۱۹۹۴ء ص ۲۳
۷۔ عاصی کاشمیری، ہجرتوں کے کرب، دانش کدہ، میرپور، ۱۹۹۵ء ص ۲۴
۸۔ مخلص وجدانی، صلیبوں کا شہر، ادبیات، مظفر آباد، ۱۹۹۵ء ص ۴۵
۹۔ عبدالرزاق بے کل، ہنگام جنوں، الفلاح پبلشرز، پشاور ۱۹۹۴ء ص ۵۶
۱۰۔ ایضاً
۱۱۔ حر کاشمیری، غیر مطبوعہ کلام
۱۲۔ اسرار ایوب، برف سے حرف، لیاقت علی پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۵ء ص ۲۳
۱۳۔ ناز مظفر آبادی، بہار آنے تک، ہم خیال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۱ء ص ۴۱
۱۴۔ آمنہ بہار، ڈاکٹر، چناروں کی آگ، انقلاب پبلشرز، راول پنڈی، ۱۹۸۷ء ص ۱۲
۱۵۔ زید اللہ فہیم، غیر مطبوعہ کلام
۱۶۔ ابراہیم گل، غیر مطبوعہ کلام
۱۷۔ اکرم سہیل، نئے اجالے ہیں خواب میرے، جمہور پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء ص ۱۴
۱۸۔ زید اللہ فہیم، غیر مطبوعہ کلام

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

۱۹۔ واحد عجاز میر، راستہ مت بدل، خزینہ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۱ء ص ۴۵
۲۰۔ مظفر احمد مظفر، غیر مطبوعہ کلام
۲۱۔ احمد عطااللہ، والہانہ، رمیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۵ء ص ۱۲
۲۲۔ محمد اکرم طاہر، پروفیسر، پھول پھول تتلی، بک کارنر، جہلم، ۲۰۱۶ء ص ۵۶
۲۳۔ اسرار ایوب، برف سے حرف، لیاقت علی پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۵ء ص ۱۶
۲۴۔ ابراہیم گل، غیر مطبوعہ کلام
۲۵۔ محمد خان نشتر، لمحات نشتر، نیلم پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۵۱
۲۶۔ خواجا محمد عارف، سعادت، تعبیر پبلی کیشنز، میر پور، ۲۰۰۶ء، ص ۵۱
۲۷۔ فیاض الحسن، ڈاکٹر، ذوق عرفان، اتفاق پرنٹنگ پریس، مظفر آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۳۵
۲۸۔ عبدالحق، پروفیسر، جنبش لب، اے۔ کے۔ بی گراف، راول پنڈی، ۲۰۱۷ء ص ۲
۲۹۔ ایضاً
۳۰۔ عبدالبصیر تاجور، غیر مطبوعہ کلام
۳۱۔ وقار احمد میر، غیر مطبوعہ کلام
۳۲۔ زاہد کلیم، روح انقلاب، قلم دوست پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۴۲
۳۳۔ منور احمد قریشی، دہلیز شب، ٹی بی ایم پبلشرز اینڈ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۲
۳۴۔ نثار حسین، ڈاکٹر، ہمدانی، چنار، چاندنی اور چنبلی، الشیخ پرنٹر، مظفر آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۳۲
۳۵۔ احمد عطااللہ، والہانہ، رمیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۵ء
۳۶۔ مخلص وجدانی، صلیبوں کا شہر، ادبیات، مظفر آباد، ۱۹۹۵ء ص ۱۶
۳۷۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، انکشاف، طیبہ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۵۶
۳۸۔ فرزانہ فرح، غیر مطبوعہ کلام
۳۹۔ ابراہیم گل، غیر مطبوعہ کلام
۴۰۔ علی عارفین، غیر مطبوعہ کلام
۴۱۔ شاہد بہار، غیر مطبوعہ کلام
۴۲۔ مقصود جعفری، ڈاکٹر، گنبدِ افلاک، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۱۸ء ص ۱۳
۴۳۔ شہزادی عظمیٰ، غیر مطبوعہ کلام
۴۴۔ فرزانہ فرح، غیر مطبوعہ کلام

۴۵۔اعجاز نعمانی، پروفیسر، کہے بغیر، رمیل ھاؤس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۹ء ص ۱۴
۴۶۔علی عارفین، غیر مطبوعہ کلام
۴۷۔فرزانہ فرح، غیر مطبوعہ کلام
۴۸۔اعجاز نعمانی، پروفیسر، کہے بغیر، رمیل ھاؤس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۹ء ص ۱۶
۴۹۔شاہد بہار، غیر مطبوعہ کلام
۵۰۔علی عارفین، غیر مطبوعہ کلام
۵۱۔امین طارق قاسمی، پروفیسر، ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرکز تحقیقات، گورنمنٹ کالج میرپور، ۲۰۱۴ء ص ۱۵
۵۲۔یامین، دھوپ کا لباس، بی، پی، ایچ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۲۱ء ص ۱۷
۵۳۔ایضاً
۵۴۔عاصی کاشمیری، ہجرتوں کے کرب، دانش کدہ، میرپور، ۱۹۹۵ء ص ۱۴
۵۵۔نذیر انجم، پلک پلک زنجیر، کاشر پبلشرز، میرپور، ۱۹۹۲ء ص ۱۵
۵۶۔ایضاً
۵۷۔احمد عطااللہ، والہانہ، رمیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۵ء ص ۱۷
۵۸۔نثار حسین ہمدانی، ڈاکٹر، چنار، چاندنی اور چنبلی، الشیخ پرنٹر، مظفر آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۳۲
۵۹۔مقصود جعفری، ڈاکٹر، گنبدِ افلاک، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۱۸ء ص ۱۵
۶۰۔الطاف قریشی، داتا زہر پلا، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء ص ۱۴
۶۱۔فیضان مرزا، غیر مطبوعہ کلام
۶۲۔ظافر گیلانی، غیر مطبوعہ کلام
۶۳۔شفیق راجا، پروفیسر، میں حرف حرف سمیٹوں، پبلشرز، طلوع باغ، ۲۰۰۲ء ص ۱۶
۶۴۔دلشاد اریب، غیر مطبوعہ کلام
۶۵۔بشیر چغتائی، رستہ بہت کٹھن ہے، نکس، میرپور، ۲۰۱۰ء ص ۱۶
۶۶۔بشارت کاظمی، غیر مطبوعہ کلام
۶۷۔ایضاً
۶۸۔الطاف عاطف، جھیل کا چاند، مہب پبلیشنگ بلوچستان، ۲۰۲۱ء ص ۱۷
۶۹۔ابراہیم گل، غیر مطبوعہ کلام
۷۰۔اکرم سہیل، نئے اجالے ہیں خواب میرے، جمہور پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء ص ۱۵

۷۱۔ احمد عطااللہ، والہانہ، رمیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۵ء ص ۱۵
۷۲۔ محمد خان نشتر، لمحات نشتر، نیلم پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۵۱
۷۳۔ امین طارق قاسمی، پروفیسر، ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرکز تحقیقات، گورنمنٹ کالج میرپور، ۲۰۱۴ء ص ۱۶
۷۴۔ ایضاً
۷۵۔ منور احمد قریشی، دہلیز شب، ٹی بی ایم پبلشرز اینڈ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۲
۷۶۔ کاشف رفیق، مراہر خواب سچا تھا، خزینہ علم وادب، لاہور، ۲۰۱۴ء ص ۱۴
۷۷۔ واحد عجاز میر، راستہ مت بدل، خزینہ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۱ء ص ۱۵
۷۸۔ وقار احمد میر، غیر مطبوعہ کلام
۷۹۔ حر کاشمیری، غیر مطبوعہ کلام
۸۰۔ ایضاً
۸۱۔ ایضاً
۸۲۔ جاوید الحسن جاوید، مہجور مدینہ، روہی بکس، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء ص ۲۳
۸۳۔ جاوید الحسن جاوید، مہجور مدینہ ء ص ۶۵

References in Roman Script:

1. Iftikhar Mughal, Dr., Urdu Poetry in Kashmir, Dissertation for M.Phil, Allama Iqbal Open University, Islamabad, 1995, P.123
2. Sabir Afaqi, Shahr Tamna, Aina Adab Chowk, Minar Pomegranate Village, Lahore, 1980, P. 23
3. Dr. Imaduddin Souz, unpublished
4. Manwar Ahmad Qureshi, Dehliz Shab, TBM Publishers and Printers, Lahore, 2014, P.22
5. Zaidullah Faheem, unpublished
6. Abdul Razzaq Baykal, Hingam Janun, Al Falah Publishers. Peshawar 1994, P. 23
7. Asi Kashmiri, Hijrat Ke Karb, Knowledge Kada, Mirpur, 1995, P.24
8. Mukhlis Wajdani, City of Crosses, Literature, Muzaffarabad, 1995 P. 45
9. Abdul Razzaq Baykal, Hingam Janun, Al Falah Publishers. Peshawar 1994 P. 56
10. Ibid
11. Har Kashmiri, unpublished text
12. Asrar Ayub, Barf Se Harf, Liaquat Ali Publishers, Lahore, 1995, P. 23
13. Naz Muzaffarabadi, Behar Aane Tak, Hum Kheal Publishers, Faisalabad, 2001 P.41
14. Amna Behar, Dr., Poplar Fire, Inqlab Publishers, Rawal Pindi, 1987, P. 12
15. Zaidullah Fahim, unpublished text
16. Abraham Gill, unpublished text

17. Akram Sohail, New Ajale Hai Khaban Mere, Jamhoor Publications, Lahore, 2016, P. 14
18. Zaidullah Fahim, unpublished text
19. Wahid Ijazmir, Rasta Mat Badal, Khazina Alam wa Abad, Lahore, 2001, P. 45
20. Muzaffar Ahmad Muzaffar, unpublished speech
21. Ahmed Attaullah, Walhana, Ramil House of Publications, Rawalpindi, 2015, P. 12
22. Muhammad Akram Tahir, Professor, Phul Phul Tatli, Book Corner, Jhelum, 2016 P.56
23. Asrar Ayub, Barf Se Harf, Liaquat Ali Publishers, Lahore, 1995, P. 16
24. Abraham Gill, unpublished text
25. Mohammad Khan Nishtar, Lamhat Nishtar, Neelam Publications, Muzaffarabad, 2001, P. 51-14
26. Khawaja Mohammad Arif, Saadat, Tabeer Publications, Mirpur, 2006, P. 51
27. Dr. Fayyazul Hasan, Zouk Irfan, Aqash Printing Press, Muzaffarabad, 2005, P. 35
28. Prof. Abdul Haq, Murad, Janbish Lub, A. K. B. Graf, Rawal Pindi, 2017.
29. Ibid
30. Abd al-Basir Tajur, unpublished text
31. Waqar Ahmad Mir, unpublished text
32. Zahid Kaleem, Spirit of Revolution, Qalam Dost Publications, Urdu Bazar Lahore, 2008, P. 42
33. Manwar Ahmad Qureshi, Dehliz Shab, TBM Publishers and Printers, Lahore, 2014, P. 22
34. Dr. Nisar Hussain Hamdani, Chinar, Chandni and Chanbali, Al-Sheikh Printer, Muzaffarabad, 1993, P. 32
35. Ahmed Attaullah, Walhana, Ramil House of Publications, Rawalpindi, 2015, P. 32
36. Mukhlis Wajdani, City of Crosses, Literature, Muzaffarabad, 1995, P. 16
37. Iftikhar Mughal, Dr., Ankshaf, Taiba Printers, Lahore, 2003, P. 56
38. Farzana Farah, unpublished Text
39. Abraham Gill, unpublished text
40. Ali Arifin, unpublished text
41. Shahid Behar, unpublished text
42. Maqsood Jafri, Dr., Gaband-e-Aflak, Fiction House Lahore, 2018, P. 13
43. Shahzadi Uzma, unpublished text
44. Farzana Farah, unpublished text
45. Ejaz Naumani, Professor, Without Saying, Rimel House of Publications, Rawal Pindi, 2019, P. 14
46. Ali Arifin, unpublished text
47. Farzana Farah, unpublished text
48. Ejaz Naumani, Professor, Without Saying, Rimel House of Publications, Rawal Pindi, 2019, P. 16
49. Shahid Behar, unpublished text
50. Ali Arifin, unpublished text

51. Amin Tariq Qasmi, Prof. Dr. Muhammad Rafiuddin Research Center, Gove.t College Mirpur, 2014, P. 15
52. Yameen, Dress of the Sun, B, P, H Printers, Lahore, 2021, P. 17
53. Ibid
54. Asi Kashmiri, Hijrat Ke Karb, Knowledge Kada, Mirpur, 1995, P. 14
55. Nazir Anjum, Pulak Pulak Zanjeer, Kasher Publishers, Mirpur, 1992, P. 15
56. Ibid
57. Ahmed Attaullah, Walhana, Ramil House of Publications, Rawalpindi, 2015, P. 17
58. Dr. Nisar Hussain Hamdani, Chanar, Chandni and chnbali, Al-Sheikh Printer, Muzaffarabad, 1993, P. 32
59. Maqsood Jafri, Dr., Gaband-e-Aflak, Fiction House Lahore, 2018, P. 15
60. Altaf Qureshi, Datta Zehr Palla, School of Poetry and Literature, Lahore, 1977, P. 14
61. Faizan Mirza, unpublished text
62. Zafar Gilani, unpublished text
63. Shafiq Raja, Professor, Mein Harf Harf Smeton, Publishers, Taloo Bagh, 2002, P. 16
64. Dilshad Areb, unpublished text
65. Bashir Chaghatai, The road is very difficult, Nix, Mirpur, 2010, P. 16
66. Basharat Kazmi, unpublished text
67. Ibid
68. Altaf Atif, Moon of the Lake, Mehb Publishing Balochistan, 2021, P.17
69. Abraham Gill, unpublished text
70. Akram Sohail, New Ajale Hai Khaban Mere, Jamhoor Publications, Lahore, 2016 P. 15
71. Ahmed Attaullah, Walhana, Rimeel House of Publications, Rawalpindi, 2015, P. 15
72. Muhammad Khan Nishtar, Moments of Nishtar, Neelam Publications, Muzaffarabad, 2001, P. 51
73. Amin Tariq Qasmi, Dr. Muhammad Rafiuddin Research Center, Govt College Mirpur, 2014, P.16
74. Ibid
75. Manwar Ahmad Qureshi, Dehliz Shab, TBM Publishers and Printers, Lahore, 2014, P. 22
76. Kashif Rafiq, My Every Dream Was True, Khazina Ilm Wadab, Lahore, 2014, P. 14
77. Wahid Ijaz mir, Rasta Mat Badal, Khazina Alam wa Abad, Lahore, 2001, P. 15
78. Waqar Ahmad Mir, unpublished text
79. Har Kashmiri, unpublished text
80. Ibid
81. Ibid
82. Javed Al Hasan Javed, Mehjoor Medina, Rohi Books, Faisalabad, 2020, P. 23
83. Javed Al Hasan Javed, Mehjoor Medina, P. 65

Dr. Muhammad Yousaf serves as the Head of the Department of Urdu at the University of Azad Jammu and Kashmir, Muzaffarabad, Pakistan. He holds a Ph.D. in Urdu, with a keen interest in Urdu poetry. Dr.Yousaf has made notable contributions to the field, with 15 published articles and 02 books, reflecting his expertise and dedication to the study and promotion of Urdu language and literature.

Dr. Ambreen Khawja is an Assistant Professor at the University of Azad Jammu and Kashmir, Muzaffarabad, Pakistan. She is renowned for her comprehensive research on Kashmiri culture, covering personalities, archaeological sites, geography, and the Kashmir issue. Holding a Ph.D. with a field of interest in Urdu fiction. Her 20 published articles and 01 book, showcasing her profound knowledge and dedication to both Kashmiri culture and Urdu literature.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

تحقیقی و تنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 4th Feb, 2024 | Accepted: 16th June, 2024 | Available Online: 30th June, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i01.382

اقبالیات اور تصوف: بشیر احمد نحوی کی اقبالیاتی فِکر کا تجزیہ

Iqbaliyat and Sufism: An Analysis of Bashir Ahmed Nahvi's Iqbalistic Thought

TALIB HUSSAIN HASHMI[1] AND DR. SYED SHIRAZ ALI ZAIDI[2]

[1] Research Scholar Ph.D. Iqbal Studies, Allama Iqbal Open University, Islamabad, Pakistan

[2] In- Charge, Department of Iqbal Studies, Allama Iqbal Open University, Islamabad, Pakistan

Corresponding author: Talib Hussain Hashmi (talib.hashmi@gmail.com)

ABSTRACT Prof. Dr. Bashir Ahmed Nahvi focused more on Iqbal and Iqbaliyat in Occupied Kashmir. That is why he is famous as a scholar on Iqbal in Occupied Jammu and Kashmir. Even though the conditions regarding Iqbaliyat in Occupied Kashmir are not so favorable, his attraction towards Iqbaliyat and continuously working on it indicate that he has a special affinity and passion for Iqbaliyat. Bashir Nahvi has presented the vision of Iqbal regarding Sufism in a proper way, because even a slight modification or contradiction in the vision of Iqbal, as a result of Nahvi's services regarding Iqbaliyat, may lead to ideological annihilation in the occupied valley. Ignoring Urdu literature and journalism and other academic and literary achievements, Bashir Ahmed Nahvi's thought on Iqbaliyat has been limited to research and criticism in the literary context of occupied Kashmir. While avoiding unnecessary expansion and exposure, as a teacher of Iqbaliyat, his character and writings were directly examined in the light of Iqbal's writings, verses and enclosures and an attempt was made to draw concrete conclusions. A Historical and documentary method of research has been adopted and conclusions have been drawn honestly through comparison, analysis and dissection adopting an objective approach. Only the primary sources were used. In the literary context of Occupied Kashmir, Bashir Ahmed's Iqbalistic thought on "Sufism" has been discussed. It is a landmark achievement by Bashir Ahmed Nahvi to promote and proselytize the teachings of such an ideological thinker and writer as Iqbal which distinguishes him as a researcher of literature on Iqbal.

Keywords Scholar on Iqbal, Bashir Ahmed Nahvi, Occupied Kashmir, Sufism, Iqbalistic thought, Fiker-e-Iqbal. Renowned Iqbal expert.

کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ایک ذہین اور فطین شخصیت بشیر احمد نحوی مقبوضہ کشمیر میں ماہرِ اقبالیات کے طور پر معروف ہیں۔ جنھیں اُردو اور اقبال سے گہرا لگاؤ ہے۔ اُنھیں تقریر و تحریر دونوں پر یکساں عبور حاصل ہے۔ اُن کی قوتِ حافظہ کا یہ عالم ہے اُنھیں علامہ اقبال کے اُردو اور فارسی کلام کا بیش تر حصّہ حِفظ ہونے کی وجہ سے حافظ اقبال کہلاتے ہیں۔ یہ اُن کی اس دل چسپی کا نتیجہ ہے جو اُنھیں طالبِ علمی کے زمانے میں علامہ اقبال کی شخصیت سے محبت ہو گئی تھی اور آگے چل کر عقیدت اور عشق کا رُوپ اختیار کر

This work *is licensed under a* Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

گئی۔ یہ عقیدت اُن کے خاندان میں بھی راسخ ہو گئی جیسے کہ ان کے مرحوم والد، دونوں بیٹے ڈاکٹر وسیم اقبال نحوی، ڈاکٹر ظفر اقبال نحوی اور دونوں بیٹیاں بھی اقبالیات سے وابستہ ہیں۔ اُنھوں نے تعلیماتِ اقبال اور فکرِ اقبال کے مختلف موضوعات پر درجنوں کتابیں اور بلا مبالغہ دَو سو سے زائد تحقیقی مضامین قلم بند کیے ہیں۔ تاہم اُن کا خاص میدان "اقبال اور تصوف" ہے۔

علمِ تحقیق کے ساتھ والہانہ ذوق و شوق کے تحت بشیر احمد نحوی نے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ کے لیے داخلہ لیا اور پروفیسر کبیر احمد جائسی کی نگرانی میں "اقبال اور تصوف" پر مقالہ لکھا اور ایم۔ فِل کی ڈگری حاصل کی۔ پھر اِسی موضوع کو وُسعت دیتے ہوئے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر آلِ احمد سُرور اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کی مشترکہ راہ نمائی میں "اقبال اور تصوف" پر مقالہ لکھ کر اکتوبر ۱۹۸۷ء میں پی ایچ۔ڈی اقبالیات کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر بدر الدین بٹ رقم طراز ہیں:

> "ایم۔ فِل کے بعد بشیر احمد نحوی کا تقرر سری نگر کے دُور درشن پروگرام میں بحیثیت اسسٹنٹ پروڈیوسر ہوا۔ یہاں اُنھوں نے کئی سال خدمات سرانجام دینے کے بعد اپنی استعداد اور صلاحیت کا لوہا منوایا مگر اقبالیات کے ساتھ غیر معمولی وابستگی بل کہ عشق نے ان کو اس ادارے سے رخصت لینے پر مجبور کر دیا اور اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر میں پروفیسر آلِ احمد سُرور اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کی مشترکہ راہ نمائی میں "اقبال اور تصوف" کے موضوع پر مقالہ تحریر کر کے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری سے سرفراز ہوئے۔"(۱)

بشیر نحوی کو اقبال کے فلسفیانہ اَفکار و نظریات سے آگاہی کے مواقع میسر ہوئے۔ وہ اقبال کے فکر و فلسفہ اور تعلیمات سے اس قدر متاثر ہیں کہ اُنھوں نے مقبوضہ کشمیر میں اقبال کا عرفان عام کرنے کی غرض سے کشمیر میں اقبال اکیڈمی قائم کی ہے۔ چناں چہ اس اکیڈمی کے پہلے سیکریٹری کے فرائض کی ذمہ داری بشیر احمد نحوی خود سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ۱۹۹۹ء ہی میں آپ اسی ادارے کے ڈائریکٹر کے منصب پر فائز ہوئے۔ نامساعد حالات کے باوجود اُنھوں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں نئی روح پھونک دی اور آج اس اِدارے کا شُمار عالمی شہرت کے تحقیقی اداروں میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کو محض ایک ریسرچ سینٹر کے محدود دائرے سے نکال کر ایک منظم ادارہ بنا دیا۔ تحقیق و تدقیق کی سرگرمیوں کے علاوہ اُنھوں نے اقبالیات سے متعلق دیگر اَبعاد پر کام کا آغاز کر دیا۔

بشیر احمد نحوی نے جب سے اس ادارے کی صدارت کا منصب سنبھالا تب سے اس میں ایک نئی شان و شوکت آگئی ہے اور ایک نئی حرکت و حرارت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے دورِ نظامت میں اس انسٹی ٹیوٹ کے اہتمام اقبال کے بارے میں مختلف موضوعات پر سیمینارز کے انعقاد، توسیعی خُطبات، مشاعروں کا انعقاد اور کتابوں کی تصنیف و تالیف کا جامع پروگرام بنایا ہے۔ اِن سرگرمیوں کے علاوہ اُنھوں نے خود بھی اقبال کے فکر و فن پر اپنی تحقیقی کاوشیں منظرِ عام پر لانے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ بشیر احمد نحوی کے دورِ نظامت میں چھ درجن کے قریب ریاستی اور قومی سطح کے سمیناروں اور محافل سیرت کا انعقاد عمل میں لایا گیا جن میں متعدد علمائے دین، ماہرین اقبالیات، سرکردہ محققین، ادبا اور شعرا حضرات اپنے مقالات، تحقیقات اور منظومات پیش کر کے سامعین سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اقبالیات کے محقق ڈاکٹر حارث حمزہ لون رقم طراز ہیں:

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

"سال ۲۰۰۳ء کے ماہ ستمبر میں پروفیسر بشیر احمد نحوی دو روزہ عظیم الشان نیشنل سیمینار منعقد کرنے میں کام یاب ہو گئے جس میں شرکت کرنے کے لیے ریاست جموں و کشمیر کے علاوہ ہندوستان کے مختلف حصّوں سے مقتدر اصحابِ علم اور ماہرین اقبالیات تشریف لے آئے اور یہاں "اقبالیات کے گذشتہ دس سال" کے عنوان پر اپنے مقالات پیش کئے جن میں مدعو سامعین محظوظ بھی ہوئے اور مقبوضہ کشمیر میں فکرِ اقبال کے فروغ کے لیے اقبالیاتی ادب میں بھی گراں قدر اضافہ ہوا۔"(۲)

بشیر احمد نحوی اپنے فکر و دانش اور ریاضت و نظامت کے بل بوتے پر اقبالیاتی اَدب میں ممتاز مقام پر نظر آتے ہیں کیوں کہ اقبالیاتی ادب میں اِن کی بیش بہا خدمات کا اعتراف ماہرین اقبالیات بھی کرتے ہیں۔ ان کے دورِ نظامت میں اُردو ادب اور اقبالیات کے ضمن میں بیش بہا کام ہوا ہے۔ نئی نسل میں فکر اقبال کے تناظر میں صالح اقدار کو علامہ اقبال کے حوالے سے عام کرنے کی کوششیں ہوئیں وہ یقینی طور پر قابل تحسین ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر بدر الدین بٹ لکھتے ہیں:

"بشیر احمد نحوی نے یونی ورسٹی کی حدود سے باہر قمریہ ہائیر اسکینڈری اسکول گاندر بل، کشمیر کالج آف ایجوکیشن سوپور، گورنمنٹ ڈگری کالج بارہ مولہ جیسے اداروں کے تعاون و اشتراک سے مباحثوں اور مذاکروں کا انعقاد کیا گیا تاکہ نئی نسل میں اقبال کا نُور بصیرت عام ہو اور سماج کے تئیں انھیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو۔ کلامِ اقبال کو گھر گھر پہنچانے کے لیے خوبصورت اسٹکر میں اس کو شائع کیا اور رعایتی داموں پر ان اسٹکر کو فروخت کیا جاتا ہے"۔(۳)

در حقیقت بشیر احمد نحوی نے یہاں کے نو آموز ادبا اور محققینِ اقبال کو کافی حد تک تصنیف و تالیف کے مواقع بہم پہنچا کر اُن کی گراں قدر حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کی صلاحیتوں کے جوہر بھی پروان چڑھایا۔ نو آموز اَدیبوں اور محققوں نے اِن کی سرپرستی میں متعدد مقالے شعبے کے سالناموں یعنی اقبالیات وغیرہ میں سپرد قلم کر کے یقیناً اپنے آپ میں خود اعتمادی کا جذبہ بیدار کیا ہے۔ بشیر نحوی کا یہ طرزِ عمل یقیناً قابلِ تحسین و تبریک ہی نہیں بل کہ قابل تقلید بھی ہے۔ بشیر نحوی ایک اعلیٰ درجے کے خطیب، ادیب اور قلم کار ہیں۔ ان کی ادارت کے دوران اقبال انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے اقبالیات کے نو شماروں (شمارہ نمبر ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۳) کے علاوہ تین درجن کے قریب مطبوعات شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی اپنی تصانیف اور مرتب شدہ کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے جو اقبال انسٹی ٹیوٹ نے شائع کرائی ہیں:

۱۔ اقبال ایک تجزیہ، ۲۔ اقبال کی تجلیات، ۳۔ نفحات اقبال، ۴۔ وہ دانائے سبل ختمِ الرسل، ۵۔ راز الوند، ۶۔ فکر آزاد، ۷۔ ارمغان نحوی، ۸۔ اقبالیات گذشتہ دس سال، ۹۔ اقبال بحر خیال اور اقبالیات کے شمارہ نمبر ۱۲، ۱۳، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۳ شامل ہیں۔

بشیر احمد نحوی کی درج ذیل انگریزی مرتبہ کتب بھی اس دوران ادارہ کی طرف سے شائع ہوئی ہیں:

(1). "Iqbal's Multiformity Complied"
(2). "Iqbal's Idea of self"
(3). "Iqbal's Religio-philosophical ideas"

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

علاوہ ازیں پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد نحوی نے درج ذیل کتب (ادارہ سے باہر) از خود شائع کی ہیں:

۱۔ اقبال-افکار واحوال، ۲۔ محسوسات (منتخب مضامین)، ۳۔ مسائلِ تصوف اور اقبال، ۴۔ اقبال۔ عرفان کی آواز
۵۔ اقبال وحدت الوجود اور وحدت الشہود ۶۔ سرحدِ ادراک ۷۔ نظریہ تصوف اور اقبال

بشیر نحوی صحیح معنوں میں علامہ اقبال کے مقلد محب اور عاشق ہیں۔ اب تک تقریباً ستّر سے زائد ایم۔ فِل اور پی ایچ۔ ڈی اسکالرز کی اُنھوں نے تربیت کی ہے اور ان میں تقریباً ایک درجن سے زائد محقق خواتین وحضرات ملک کے مختلف جامعات اور کالجوں میں اپنی درسی اور دیگر منصبی فرایض سر انجام دے رہے ہیں۔ اِس وقت بھی کئی سکالرز آپ کی زیر تربیت فکریاتِ اقبال کے حوالے سے مختلف موضوعات پر اپنی تحقیقی سرگرمیوں میں منہمک ہیں۔ اِس ضمن میں اُردو ادب کی بہت بڑی شخصیت پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی رقمطراز ہیں:

> "غرض جِس پہلو سے بھی دیکھا جائے جناب بشیر نحوی گوناگُوں اوصافِ حمیدہ کے حامل ہیں۔ ایک مکمل شخصیت جو علم واَدب اور دین وتصوف کے بنیادی ماخذ سے وابستہ وپیوستہ ہو، بشیر نحوی کی شخصیت ہے۔"(۴)

مقبوضہ کشمیر کے ادبی تناظر میں بشیر احمد نحوی کی اقبالیاتی فکر تصوف کے ساتھ آپ کی دل چسپی قابل ستائش ہے۔ اقبالیات سے متعلق کوئی بھی کام ہو، کوئی بھی سیمینار، کانفرنس، مباحثہ یا مذاکرہ ہو، بشیر نحوی کے ذکرِ خیر کے بغیر ادھورا ہی متصور ہو گا۔ اِقبالیات کے علاوہ قرآنیات، احادیث نبوی، واقعات اولیاواتقیا سے شناسائی میں بشیر احمد نحوی کسی سے پیچھے نہیں۔

بشیر احمد نحوی نے تصوف پر مقالہ اور کتب بھی لکھیں۔ بشیر احمد نحوی کی تصنیف "مسائلِ تصوف اور اقبال" دراصل ان کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے پی ایچ۔ ڈی کے لیے پروفیسر آل احمد سرور اور جناب ضیاء الحسن فاروقی کی مشترکہ نگرانی میں تحریر کیا۔ اس مقالے کے ضمن میں پیر نصیر احمد رقم طراز ہیں:

> "گیارہ ابواب پر مشتمل اس پُر مغز مقالے میں تصوف کے بارے میں مختلف نظریات خاص طور پر وجود وشہود کے نظریہ پر ایک تسلی بخش بحث کی گئی ہے۔ تصوف کے حوالے سے اقبال کے وقتاً فوقتاً کیے گئے شدید ردِ عمل کا بھی تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔" (۵)

مقبوضہ کشمیر کے ادبی تناظر میں بشیر احمد نحوی کی اقبالیاتی فکر میں "تصوف" اہم عنصر ہے۔ اسی حوالے سے ڈاکٹر بدرالدین بٹ مزید لکھتے ہیں:

> "اقبال کے دل ودماغ میں صوفیہ کے کس گروہ اور تصوف کی کس شاخ یا سلسلے کا احترام موجزن تھا اور اس کے کیا اسباب ومحرکات تھے اس پر بھی اس مقالے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔"(۶)

"نظریۂ تصوف اور اقبال" اس کتاب کے حرفِ آغاز میں پروفیسر نحوی یوں رقم طراز ہیں:

> "نظریۂ تصوف اور اقبال" کی اشاعت پر اس بات کو وضاحت سے پیش کرنا ضروری ہے کہ ہمہ پہلو شخصیت اور اس شخصیت سے وابستہ افکار وتصورات میں نظریۂ تصوف اپنی انفرادیت کا حامل موضوع ہے۔ متعدد اصحابِ

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

علم و قلم نے اس موضوع پر اپنے اپنے منفرد انداز میں وضاحت کی ہے لیکن موضوع اس قدر سنجیدہ اور ہمہ گیر ہے کہ اس پر مزید غور و فکر کرنے کے امکانات موجود ہیں۔ اقبال خالص اسلامی تصوف کے حامی تھے اور تصوف میں تمام غیر اسلامی عناصر کو زائل کرنے میں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں"(۷)

کتاب کے پہلے ایڈیشن میں پروفیسر بشیر احمد نحوی کا لکھا ہوا پیش لفظ بھی شامل ہے جس میں وہ اس موضوع کی اہمیت اور پیچیدگی پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:"تصوف کے کثیر الابعاد موضوع پر مشرق و مغرب کے علما اور صوفیہ نے مدلل اور مفصل کتابیں سپردِ قلم کی ہیں۔ مذکورہ موضوع دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے پیچیدہ بھی ہے۔ اس موضوع کو اقبال کے فِکری اور شعری سفر میں اہم سنگِ راہ کی حیثیت حاصل ہے۔ چناں چہ اقبال نے اپنی نظم و نثر میں تصوف کے بطن سے جنم لینے والے بیشتر مسائل و امور اور اطراف و جہات کی بالتفصیل وضاحت کی ہے۔

"میں نے اس کتاب میں تصوف کے بطن سے جنم لینے والے بیشتر مسائل و امور اور اطراف و جہات کی بالتفصیل وضاحت کی ہے۔ میں نے اس کتاب میں تصوف سے متعلق ان مختلف نظریات بالخصوص وجود و شہود کے نظریے سے تفصیلی بحث کی ہے اور اس سلسلے میں علما و صوفیہ کی گراں بار آرا کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ چناں چہ جزئیات میں الجھنے سے بچ کر اقبال کے اس شدید ردِّ عمل کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جو انھوں نے تصوف کے حوالے سے وقتاً فوقتاً ظاہر کیا ہے۔ اقبال کے دل و دماغ میں صوفیہ کی کس شاخ یا سلسلے کا احترام موجزن تھا اور اس کے کیا اسباب و محرکات تھے اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تصوف میں کئی اُمور متنازع رہے ہیں جن پر علما کے درمیان بڑی تلخ نوائی ہوتی رہی ہے۔ میں نے ان امور میں صرف وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے تعلق سے حضرت ابن عربی اور حضرت مجددالفِ ثانی کے خیالات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔"(۸)

بشیر احمد نحوی نے تصوف کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی ہے جس میں عُلما و فضلا کی آرا سے مدد لی گئی ہے۔ پھر صوفیہ کا تاریخی پس منظر مدِ نظر رکھتے ہوئے صوفیائے کرام کے مختلف گروہوں پر تفصیل سے بات کی ہے۔ ان گروہوں کی بابت بات کرتے ہوئے پروفیسر بشیر احمد نحوی اس طرح رقم طراز ہیں :

"خلافتِ راشدہ اور سانحہ کربلا کے بعد جو دُوسرے واقعات ظہور پذیر ہوئے، ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اُمت میں علما اور صُوفیہ کا ایک گروہ پیدا کیا۔ صوفیائے کرام کا دُوسرا گروہ اس وقت سامنے آگیا جب یونان کے عقلیت پسند فلسفے نے شریعتِ اسلامیہ کی بنیادوں کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔ صُوفیائے کرام کا تیسرا گروہ دسویں صدی عیسوی سے متعلق ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان فقہی مسائل و معاملات کی پیچیدگیوں میں اُلجھ کر اپنی منزل اور اصل کو بُھول چکے تھے۔"(۹)

پروفیسر بشیر احمد نحوی نے تصوف کے بارے میں وضاحت کی ہے کہ تصوف کی تحریک نے کن حالات اور کن منازل سے گزر کر ترقی کی اور کیسے پھلی پھولی۔ پھر کس طرح یہ اصل راستے سے ہٹ کر انحراف کی راہ پر چل نکلی۔ اپنے بیان کی تائید میں وہ لکھتے ہیں :

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

"تصوف تصفیۂ اخلاق، تزکیۂ باطن کی صفات پیدا کرنے اور اُنھیں پروان چڑھانے کے لیے وجود میں آیا تھا، رفتہ رفتہ اپنی اصلیت اور حقانیت سے ہٹ کر نقطۂ انحراف کی طرف بڑھنے لگا۔ تصوف کے ساتھ ایسے لوگ بھی وابستہ ہو گئے جو علم و عمل اور تقویٰ وطہارت سے عاری تھے اور انھوں نے ایسی اصطلاحات گھڑ لیں جو براہِ راست قرآن مجید اور سنّت نبوی ﷺ کے ساتھ متصادم تھیں۔ اسلام نے عبادات کے جو قاعدے مقرر کر کیے ہیں ان لوگوں نے ان قاعدوں کا ہی تمسخر اڑانا شروع کیا اور اس طرح شریعت کے فرائض و احکام سے لاتعلقی کا ماحول پیدا ہونے لگا۔"(۱۰)

پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد نحوی نے پانچویں صدی کے ایک معروف صوفی بزرگ سید ابوالحسن علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی فارسی کتاب "کشف المحجوب" اور صوفیہ کے مختلف فرقوں کے بارے میں تفصیل سے بات کی ہے۔ "کشف المحجوب" صوفیہ کے نزدیک بڑی متبرک کتاب ہے جسے وہ بغیر وضو کے چھوتے بھی نہیں۔ اُنھوں نے تصوف کے بارے میں صوفیہ کے تمام سلسلوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ صوفیہ نے جب اپنا فکری نظام ترتیب دے لیا تو بعض صوفیہ و مشائخ کی کوششوں اور محنتوں سے اس کی بنیادیں اُستوار ہو گئیں۔ پھر آہستہ آہستہ تصوف کے کئی سلاسل ظہور پذیر ہونے لگے۔ ہر سلسلہ شریعت کے ساتھ مطابقت و متابعت کرتے ہوئے اپنے مخصوص طریقۂ عمل و نصاب پر گامزن رہا۔ یوں عام لوگوں کی مذہبی و اخلاقی رہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دیتا رہا۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں :

"سلاسل جو معرضِ وجود میں آ گئے ان میں پانچ سلسلوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی۔ وہ پانچ سلسلے حسبِ ذیل ہیں: سلسلۂ نقشبندیہ، سلسلۂ قادریہ، سلسلۂ چشتیہ، سلسلۂ سہروردیہ، سلسلۂ کبرویہ۔"(۱۱)

اس پہ مستزاد یہ کہ پروفیسر بشیر احمد نحوی نے تصوف کے حوالے سے پیدا شدہ ابہام و شبہات پر اکابر کی آرا کے پس منظر میں ایک تفصیلی بحث کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نظریۂ وحدت الوجود اور اسلامی نظریۂ توحید میں کوئی تفاوت یا اختلاف نہیں۔ وہ اس ضمن میں دلائل پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلامی نظریۂ توحید کے مطابق بھی اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے اور کائنات کی ہر شے ذات میں موجود ہے اور نظریۂ وحدت الوجود کے مطابق بھی ذاتِ باری ہر جگہ موجود ہے اور کوئی شے اس سے علاحدہ نہیں ہے۔ اسلامی توحید Monothism کے برعکس جو نظریۂ وحدت الوجود ہے وہ عیسائیوں یا ہندوؤں کا نظریۂ وحدت الوجود ہے جس میں جزو کو بھی کل کے مترادف قرار دیا جاتا ہے اور قطرے کو بھی سمندر سمجھا جاتا ہے حالانکہ قطرہ اگرچہ سمندر کا ادنیٰ حصہ ہے اور سمندر ہر گز نہیں کہلا سکتا۔

ببیں تفاوت راہ از کجا تا بہ کجا

اس بابت پروفیسر بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں :

"الغرض علامہ کے یہاں کہیں وحدت الوجود کا انتہائی نظریہ نہیں ملتا۔ ان کے کلام میں اگر کہیں کہیں وحدت الوجودی رنگ نظر آتا ہے تو اس میں ایک اعتدال ہے اور یہ توحیدِ خالص یا وحدت شہود کے منافی نہیں بل کہ موافق ہے۔"(۱۲)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

پروفیسر بشیر احمد نحوی روایتی تصوف پر بات کرتے ہوئے اقبال کے نظریۂ تصوف تک پہنچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اقبال نے جو وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا ہے اس سے اختلاف ہی ظاہر کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں :

"تصوف سے متعلق اقبال کے اجتہادی تصورات سے علما نے اگر اتفاق سے زیادہ اختلاف کیا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اقبال شاعرِ اسلام ہونے کے ساتھ ساتھ مشرق خصوصاً برصغیر کی بیداری اور تعمیرِ نو کے شاعر بھی ہیں اور تصوف سمیت جتنے بھی مذہبی، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی نکات پر اقبال نے خیال آرائی کی ہے اپنی اس ہمہ جہت حیثیت سے کی ہے ایک منفرد اور اجتہادی انداز کے ساتھ۔ البتہ یہ منفرد رویہ اور اجتہادی انداز اس غیر معمولی تاریخی، عمرانی، ثقافتی اور فنی شعور سے عبارت ہے جو اقبال کے یہاں اسلامی ہندوستان اور یورپی نظریات، حیات اور اقدار و روایاتِ علم و فن کے بصیرت مندانہ تجزیہ و تحلیل کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔"(۱۳)

اقبال نے جس تصوف پر اپنے سخت ردِّ عمل اور تحفظات کا اظہار کیا وہ خالصتاً عجمی روایات پر مبنی اور غیر اِسلامی تھا، توحیدِ خالص کے برعکس اور اس کے منافی تھا۔ اقبال شروع میں وجودی تھے لیکن جوں جوں وہ قرآن پر تدبر کرتے گئے ان پر بعض مقتدر صوفیہ کے غیر اسلامی عقائد و مسائل واضح ہوتے چلے گئے۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی اس حوالے سے لکھتے ہیں :

"اقبال موحد ہے اور توحید میں کسی قسم کے اشتراک کو گوارا نہیں کرتا۔ مسلمانوں میں جو بعد میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بحثیں چھڑ گئیں، اقبال کے نزدیک یہ بحثیں نہیں بل کہ فلسفیانہ مسائل و مباحث ہیں۔ اسلام میں توحید کے مقابلے میں فقط شرک ہے۔ وحدت و کثرت کی بحث اسلامی بحث نہیں اور نہ ہی اشاعرہ اور معتزلہ کے یہ کلامی مباحث، اصل اسلام سے کچھ تعلق رکھتے ہیں۔ وحدتِ ذات کے اندر کثرت، صفات الٰہیہ عین ذات ہیں یا غیر ذات۔ اس کے نزدیک خدا ایک نفسِ کلی یا ایک انا ہے، انائے کامل و مطلق خدا ہے۔ اس کی عینی اور اساسی صفت خلاقی ہے۔ کل یوم ھو فی شان کے معنی اقبال کے نزدیک یہی ہیں کہ اس کی خلاقی مسلسل اور لامتناہی ہے۔ کن فیکون کی صدا ہر لمحے میں آ رہی ہے۔"(۱۴)

پروفیسر بشیر احمد نحوی نے اقبال کے اس سخت رد عمل کو ظاہر کیا ہے جس کا کھلم کھلا اظہار انھوں نے اپنی مشہور زمانہ نظم "شمع اور شاعر" میں کیا اور بعد ازاں اپنی فارسی مثنوی اسرارِ خودی میں تو واشگاف انداز میں عجمی تصوف کے خلاف اعلانِ بغاوت کیا۔ یہ علامہ اقبال کی شریعتِ اسلامیہ کے احیا کی ایک مخلصانہ کوشش تھی۔ علامہ محمد اقبالؒ اس بابت خود لکھتے ہیں :

"ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کے منہ مبارک سے ہوئی۔"(۱۵)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

اقبال بنیادی طور پر ملّتِ اسلامیہ اور مشرقی اَقوام کی جدّوجہد اور عمل پر ہی توجہ مرکوز رکھتے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ مشرق رہبانیت پر عمل پیرا ہو کر بے عملی کا شکار ہو جائے۔ اِسی وجہ سے اُنھوں نے وحدت الوجودی رہبانیت کو رَدّ کیا اور وحدت الشہود کی حمایت کی تھی۔ بشیر احمد نحوی نے اپنی ساری زندگی اپنے کلام، اپنے قول و فعل سے اس غیر اسلامی عجمی تصوف کی مخالفت کی اور ازالے کے طور پر اسے درست شکل میں، قرآن و سنت کی متابعت اور مطابقت میں پیش کر کے درست سمت رہنمائی کی۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی رہبانیت کے بارے میں لکھتے ہیں :

> "رہبانیت دنیا کی ہر مستعد قوم میں اس کے عملی زوال کے وقت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مٹانا ناممکن ہے کہ بعض رہبانیت پسند طبائع ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ جو کچھ ہم کر سکتے ہیں وہ صرف اسی قدر ہے کہ اپنے دین کی حفاظت کریں اور اس کو رہبانیت کے زہریلے اثر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔"(۱۶)

پروفیسر بشیر احمد نحوی نے بیشتر حوالے ابنِ عربی اور مجدد الف ثانی کے وجودی و شہودی دلائل سے اخذ کردہ ہیں اور ان ہی عمائدین کے تقابل سے انھوں نے اقبال کی فکر کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے حالاں کہ اقبال نے خود بھی ان دونوں بزرگوں کے خیالات پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اقبال پر ان دونوں سردارانِ فکر و نظر کے اثرات نمایاں ہیں۔ اقبال شروع میں جہاں مولانا رومی کے زیر اثر تھے وہیں مجدد الف ثانی سے بھی متاثر تھے۔ مجدد الف ثانی اور علامہ اقبال کے خیالات میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی اس حوالے سے لکھتے ہیں :

> "مجدد الف ثانی اور علامہ اقبال کے افکار میں بظاہر جو مماثلت نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں کے دل میں ولولہ تھا کہ لوگوں کے خیالات کا رُخ اسلام کی طرف پھیرا جائے، دونوں کو اس بات پر اصرار ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذاتِ گرامی اسوۂ کامل اور معیارِ کمال کی حیثیت رکھتی ہے۔"(۱۷)

اقبال کے متصوفانہ تصورات کے سلسلے میں کچھ لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اقبال تصوف کے خلاف تھے اور اسے ملت اسلامیہ کے لیے مَضَرَّت رَساں خیال کرتے تھے۔ ان لوگوں کی رائے میں اقبال کا وحدت الوجود کے تعلق سے سوچ اور اپروچ معاندانہ نوعیت کا ہے۔ مجھے اس خیال کے ساتھ اتفاق نہیں اس لیے اقبال نے اس بات کی متعدد بار وضاحت کی ہے کہ جب تصوف فلسفہ بنتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔

مقبوضہ کشمیر کے ادبی تناظر میں بشیر احمد کی اقبالیاتی فکر "تصوف" پر بحث کی گئی ہے۔ مقبوضہ وادی میں اقبال ایسے نظریاتی مفکر اور ادیب کی تعلیمات کی ترویج و اشاعت بشیر احمد نحوی کا ایک بڑا کارنامہ ہے جو اُنھیں اقبالیاتی ادب کے محقق کے طور پر خاص ممتاز کرتا ہے۔

بشیر احمد نحوی اس بات سے واقف ہیں کہ اقبال کی حقیقت اور عظمت اس بات میں مضمر ہے کہ اُنھوں نے مختلف نظام ہائے زندگی میں جن باتوں کو ملی، قومی اور معاشرتی اعتبار سے مُضِر سمجھا۔ اُنھوں نے ان کی بھرپور تردید کی، چاہے ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے وہ باتیں کتنی ہی خوشنما اور دل کشا کیوں نہ تھیں۔ اقبال زندگی کے شاعر تھے۔ ان کا نظریہ حرکت و حرارت، جہد و عمل اور طاقت

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

وتوانائی کے عالمگیر اصولوں پر مبنی تھا اور ساری عُمر اپنے فکر وفن سے ان ہی اصولوں کی نگہبانی اور ترجمانی کرتے رہے۔ تصوف ان کے ہاں یقیناً ایک روحانی تحریک تھی۔

بشیر احمد نحوی نے مثالی دقتِ نظری اور عرق ریزی سے تصوف کے مسائل کو ممکنہ اور مختلف ماخذ کو کھنگال کر اُجاگر کیا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود یا ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کو تاریخی شواہد کی روشنی میں اس طرح بحث کا موضوع بنایا کہ شکوک و شبہات کے بادل از خود چھٹ جاتے ہیں اور طمانیت وتیقُّن کا سُورج ظلمات کے اندھیروں پر ضَوفگَن ہوتا ہے۔

بشیر احمد نحوی نے نہایت علم و دانش سے اس پیچیدہ، کٹھن اور دقیق مسئلے پر قلم اٹھایا۔ اس کو کھول کر بیان کیا اور حق تو یہ ہے کہ مدلل حوالوں سے بیان کر کے اس کا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے اس مسئلے پر اقبال کے رویےّ اور ان کے ردّ و قبول کو ان کے کلام کے حوالے سے ثابت کیا۔ انھوں نے حتی الامکان توازن کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی توجہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر مرکوز رکھی۔ دورانِ بحث غور و فکر کے اکثر حوالے انھوں نے ابنِ عربی، مجدد الفِ ثانی، امام غزالی، مولانا روم اور حافظ شیرازی کے کلام سے اخذ کیے ہیں اور پھر انہی کے خیالات کے تقابلی جائزے کے آئینے میں اقبال کے اثر و نفوذ کی خصوصیت اور ردّ و قبول کی جانچ کی ہے۔

بشیر احمد نحوی نے شائستگی، باسلیقہ ہنرمندی اور سرفراز نیازمندی سے قرآن و حدیث کی روشنی میں تصوف کے موضوع سے مربوط بنیادی اصطلاحات کے چہرے سے نقاب الٹ کر اصل حقائق سے شائقینِ محترم کا رشتہ باندھا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے جس کے لیے وہ لائق صد تحسین و آفرین ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ بدر الدین بٹ، ڈاکٹر، جامعہ کشمیر اور اقبالیات، مخدومی پرنٹرز، سری نگر، ۲۰۰۹ء، ص۵۱۶

۲۔ حارث حمزہ لون، ڈاکٹر، اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کشمیر کی اقبالیاتی خدمات، کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۲۰ء، ص۲۱۲، ۲۱۳

۳۔ بدر الدین بٹ، ڈاکٹر، جامعہ کشمیر اور اقبالیات۔ ص۳۳۹

۴۔ فیض قاضی آبادی، ڈاکٹر، مرتب، پروفیسر بشیر احمد نحوی قدم بہ قدم منزل بہ منزل، ٹی۔ ایف۔ سی، سینٹر گاؤ کدل، سری نگر، ۲۰۲۰ء، ص۴۱

۵۔ پیر نصیر احمد عازم، ڈاکٹر، کشمیر میں اقبال شناسی کا سفر، المیزان پبلی کیشنز، سری نگر، ۲۰۱۲ء، ص۱۴۷

۶۔ بدر الدین بٹ، ڈاکٹر، جامعہ کشمیر اور اقبالیات۔ ص۵۵۳

۷۔ بشیر احمد نحوی، ڈاکٹر، نظریۂ تصوف اور اقبال، میزان پبلشرز، بٹہ مالو سری نگر، ۲۰۱۱ء، ص۔ الف

۸۔ بشیر احمد نحوی، ڈاکٹر، نظریۂ تصوف اور اقبال، ص۔ الف

۹۔ ایضاً، ص۱۰، ۱۲، ۱۴

۱۰۔ ایضاً، ص۲۳

۱۱۔ایضاً، ص ۳۴

۱۲۔ایضاً، ص ۱۶۷

۱۳۔بشیر احمد نحوی، پروفیسر، مرتب، اقبالیات۔ گزشتہ دس سال، تحقیقی وتنقیدی جائزہ، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی، کشمیر، ۲۰۰۴ء، ص ۶۹

۱۴۔بشیر احمد نحوی، ڈاکٹر، نظریۂ تصوف اور اقبال، ص ۱۷۱

۱۵۔ایضاً، ص ۱۶۱

۱۶۔ایضاً، ص ۱۲۰

۱۷۔ایضاً، ص ۱۲۱

References in Roman Script:

1. Badar-ul-Deen Butt, Dr, Jamea Kashmir aur Iqbaliyat, Makhdomi printers, Srinagar, 2009, P.516
2. Haris Hamza Lone, Dr, Iqbal Institute of Culture and Philosophy Kashmir Ki Iqbaliyati Khidmaat", (Nahi Dehli: Creative Star Publications, Decemeber 2020), P. 212 to 213
3. Badar-ul-Deen Butt, Dr, "Jamea Kashmir aur Iqbaliyat", P. 339
4. Faiz Qaazi Abadi, Dr, Murattab, "Professor Basheer Ahmad Navvi: Qadam Ba Qadam Manzil Ba Manzil", (Sri Nagar: T.F.C, Center Gawkadal, 2020), P. 41
5. Peer Naseer Ahmed Ahzim, "Kashmir mein Iqbal Shanasi ka Safar", (Sri Nagar: Al-Mezan Publications, 2012), P. 147
6. Badar-ul-Deen Butt, Dr, "Jamea Kashmir aur Iqbaliyat", P. 553
7. Basheer Ahmed Nahvi, Dr. "Nazria e Tasavwuf aur Iqbal", (Bata Malo Sri Nagar: Al-Mezan Publications, 2011), P. Alaf
8. Basheer Ahmed Nahvi, Dr. "Nazria e Tasavwuf aur Iqbal", P. Alaf
9. Ibid, P. 10,12,14
10. Ibid, P. 23
11. Ibid, P. 34
12. Ibid, P.167
13. Basheer Ahmed Nahvi,Dr. "Iqbaliyat-Ghuzahsta Das Saal(Tehqeeqi-O-Tanqeedi Jayeza", (Kashmir:Iqbal Institute Kashmir University,Feb, 2004), P. 69
14. Basheer Ahmed Nahvi,Dr. "Nazria e Tasavwuf aur Iqbal", P. 171
15. Ibid, P.161
16. Ibid, P.120
17. Ibid, P.121

Mr. Talib Hussain Hashmi received his M. Phil Iqbal studies degree from AIOU, Islamabad where he is currently pursuing the Ph.D. degree with the department of Iqbal Studies. He is also serving as a Headmaster at Punjab School Education Department. His research interests mainly focus on Iqbaliat, over 03 books and 60 articles have been published. He has attended a significant number of local and international conferences.

Dr. Syed Shiraz Ali Zaidi received the Ph.D. degree in Urdu from the University of Karachi, Pakistan. He is currently a faculty member and In- Charge of the Department of Iqbal Studies, Allama Iqbal Open University, Islamabad, Pakistan. He has authored over 50 articles and 04 books and attended numerous local and international conferences where he has presented papers. His research interests include Urdu poetry and Iqbaliat.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 11th Feb, 2024 | Accepted: 16th June, 2024 | Available Online: 30th June, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i01.379

"ساسا" کے کرداروں پر میڈیائی پروپیگنڈا کے اثرات

Influence of Media Propaganda on the Characters of "Sasa"

DR. MUHAMMAD SOHAIL IQBAL[1] AND DR. TAHIRA GHAFOOR [2]

[1] PhD Urdu Alumni, International Islamic University, Islamabad, Pakistan

[2] Lecturer Urdu, Government Graduate College, Satellite Town, Rawalpindi, Pakistan

Corresponding author: Dr. Muhammad Sohail Iqbal (m.sohail1005@gmail.com)

ABSTRACT The historical background of the under-study Urdu novel "Sasa" is a tragedy set in the 21st century. The incident of 11th September 2001, stands as a poignant historical event, reshaping the global political landscape in mere hours. This paper analyses the novel Sasa delving into the far-reaching consequences of the twin tower demolition in New York, particularly resonating across the Muslim world. The repercussions of this calamitous and violent incident extend beyond geographical borders, leaving an indelible mark on nations such as Pakistan, Afghanistan, and Iraq. However, a significant facet of this impact is observed through the lens of Pakistani Muslims residing in the United States and Western countries, who directly grappled with the aftermath of the tragedy. Central to the novel's narrative are characters who embody the multifaceted questions surrounding the motivations behind the tragedy. These questions are intricately woven into the characters' actions and dialogues, unravelling a complex interplay of political, social, and economic issues. As the characters navigate their identities both domestically and abroad, themes of identity, conflict, and harmony emerge as pivotal touchpoints. Within the narrative, Muslim characters hopelessly long for a path of peace amidst the prevailing tide of war, intolerance and animosity propagated by Western and European media. Central to the novel's narrative is a character named Saleem who embodies the multifaceted questions. In quest of his long hunted answer to the question of Love he travels to America, but he had to face hatred instead. This research employs a qualitative analysis approach, utilizing textual analysis and thematic exploration to unearth the layers of meaning embedded within the characters' experiences and interactions. By contextualizing the characters within a global framework, this study seeks to shed light on the intricate web of human emotions, motivations, and responses triggered by Sasa. Ultimately, the findings contribute to a deeper understanding of the broader sociopolitical repercussions of traumatic events and underline the importance of nuanced narratives that counter prevailing biases and prejudices.

Keywords Sasa, Character, Saleem, Love, America, Janney, 9/11, Media, Propaganda, sociopolitical, comprehensive.

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو دو اغوا شدہ طیارے امریکہ کے شہر نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرائے گئے جس سے چند منٹوں میں ۱۱۰

This work *is licensed under a* **Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)**

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

منزلہ عمارت زمین بوس ہو گئی۔ ۹/۱۱ کو وقوع پذیر ہوئے طویل عرصہ بیت چکا ہے لیکن اس کے اثرات ابھی تک جاری ہیں۔ جس طرح ۹/۱۱ کے واقعہ نے زندگی کے دوسرے تمام شعبہ ہائے زندگی پر اثرات مرتب کیے ہیں، اسی طرح عالمی ادب پر بھی اس کے نمایاں اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اُردو ناول پر بھی ۹/۱۱ نے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ سلیم ناول کا مرکزی کردار ہے جس کے ذریعے نائن الیون کے بعد کی صورت حال کو موضوع بنایا ہے۔ سلیم پاکستان سے محبت کا سوال لے کر امریکہ جاتا ہے لیکن سلیم کو نائن الیون کے بعد نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امریکہ اور یورپی ممالک میں مقیم مسلمانوں خصوصاً پاکستانیوں پر اس سانحہ کے اثرات اور پاکستانیوں سے نفرت کا بیانیہ ناول "ساسا" کا بنیادی موضوع ہے۔ ناول کے کرداروں پر سانحہ ۹/۱۱ کے اثرات نمایاں ہیں۔ ان اثرات کو تجزیاتی انداز سے پرکھا گیا ہے۔

محمد شیراز دستی کا ناول "ساسا" سماجیاتی فکر کا حامل ہے ۔ ناول کی کہانی سلیم سے پوچھے گئے ایک سوال "محبت کہاں ہے" سے شروع ہوتی ہے۔ سلیم سے یہ سوال گاؤں کے سکول ماسٹر نے کیا ہے۔ جواب کی تلاش میں سلیم سات سمندر بھی پار کر جاتا ہے جس کی بدولت سلیم پر عصر حاضر کی ایسی معنویت آشکار ہوتی ہیں جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ امریکہ جیسے ملک میں "سانحہ ۹/۱۱" کے بعد عصری چنگیزیت کے چہرے، بھولے امریکی عوام کی معصومیت اور سامراجی قوتوں کی سیاسی اتھل پتھل کے بل بوتے پر بوئے جانے والے تہذیبی تصادم کے بیج، مغرب کی اسلام دشمنی، تیسری دنیا کے معاملات میں مداخلت، غریب اور محکوم ممالک کا صفہ ہستی سے صفایا، جیسے معاملات کا ایک وسیع فکری اور سماجی دائرہ ہے۔ اس سیاسی منظر نامے کا سمجھنا بھولے امریکی عوام کی سمجھ سے کوسوں دور ہے:

> "بہ ظاہر یہ ایک عام سی کہانی ہے اور سلیم کا سفر دائرہ کا ہے، مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے ۔ محبت کی تلاش، سلیم کو معاصر زندگی کی سب چھوٹی بڑی سیاسی، ثقافتی، میڈیائی حقیقتوں سے متعارف کرواتی ہے کس طرح مابعد گیارہ ستمبر دنیا میں سب پاکستانی شناخت کی سیاست کا شکار ہوتے ہیں اور ان جرائم میں ملوث سمجھے جانے لگتے ہیں جو انھوں نے کیے ہی نہیں ۔ کس طرح پاک بھارت تعلقات دونوں ملکوں کے شہریوں کے روز مرہ رویوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کس طرح سلیم کا شعور امریکہ اور پاکستانی یا عالمی و مقامی دنیاؤں کا مقابلہ کرنے اور انھیں سمجھنے کی کوشش کرنے میں مسلسل حال و ماضی کے منطقوں میں محو سفر رہتا ہے۔ کس طرح اسی دوران میں وہ انسانی حقوق، شہری آزادیوں اور عمومی انسانی صورت حال سے متعلق دونوں دنیاؤں کے فرق اور عالمی دنیا کے تضادات سے آگاہ ہوتا ہے۔"(۱)

سلیم ناول کا مرکزی کردار ہے جس کی پرچی پر مدھم روشنائی سے "محبت" لکھا ہے۔ اس محبت کی تلاش وہ اپنے گاؤں سے ہی کرتا ہے اور پہلا سوال چچی سے کرتا ہے کہ "چچی آپ نے محبت تو نہیں دیکھی؟"(۲) یہ سوال مسلسل گاؤں کی کئی عورتوں سے پوچھا جاتا ہے، جس پر اس کو دشنام بھی سننا پڑتی ہیں ۔ گاؤں کی ایک بوڑھی عورت سے سوال کرنے پر گاؤں کی ساری عورتوں کے مرد گھروں سے باہر

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

نکل آئے ۔اب منزہ کے دادا سے پوچھنا باقی رہے گیا تھا۔ سلیم کو اپنے دادا کا ایسا ہی خوف ہے جیسا تیسری دنیا اور خصوصاً پاکستان کو امریکہ سے ہے ۔ آخر ہمت کر کے سوال کیا گیا" دادا مجھے محبت کہاں سے ملے گی؟(۳)

مغربی دنیا نے اب یہ طریقہ اپنایا ہوا ہے کہ جب تیسری دنیا کے کسی حکمران کو اقتدار سے ہٹانا ہو تو سب سے پہلے میڈیا سے کام لیا جاتا ہے۔ میڈیا اس سیاسی کھیل میں ہراول دستے کا کام دیتا ہے۔ میڈیا عالمی طاقتوں اور ان ممالک کی خفیہ ایجنسیوں سے ملی بھگت کرتا ہے۔ میڈیا کو اس کام کے لیے بڑی رقم، مراعات اور سہولیات سے نوازا جاتا ہے۔ میڈیا حکمرانوں کی ذاتی زندگی اور سیاسی کردار کے بارے میں من گھڑت کہانیاں اور خبریں بنا کر حکمران کی کردار کشی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح عالمی سطح پر ان کے خلاف نفرت کا بیانیہ جنم لیتا ہے اور قومی سطح پر بھی۔ جس حکمران کو اقتدار میں لانا ہوتا ہے اس کے بارے میں ایسی اچھی اور حیران کن خبریں دینا شروع کرتے ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہ سنی گئی ہوں۔ اس سب کی بنیادی وجہ ہی یہ ہے کہ عصر حاضر میں میڈیا کا کردار فیصلہ کن حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

سلیم بھی محبت کا پنچھی بن کر اینا کی آنکھوں میں بسیرا کر بیٹھا تھا جو کئی دن سے غائب تھی۔ سلیم نے برقی پیغامات دیکھے تو ایک ای میل پر نظر پڑی جس میں سلیم کی کہانی نہ چھاپنے کی معذرت کی گئی تھی کیوں کہ ایڈیٹر کے مطابق آپ کی کہانی بہت ہی دلچسپ ہے سوائے آپ کے مرکزی کردار منزہ کے جو غیر حقیقی ہے۔ یہ اصل میں دو تہذیبوں کا فرق ہے جو ایڈیٹر کی سمجھ سے باہر تھا۔ جینی کو اپنے "ساسا" سے محبت ہے جس کی طبیعت خراب ہے اور جس کو ہسپتال لے جانے کے لئے ایک ایمبولینس منگوائی جاتی ہے جب کہ خود سلیم کے ملک پاکستان میں تھر کے علاقے میں قحط سالی پیدا کر کے دو سو بچے مار دیے گئے۔

مغربی میڈیا نے تیسری دنیا میں اپنی عوام کے مفاد میں انسانی حقوق کو ایک نئے مذہب کا درجہ دے دیا ہے۔ بنیادی انسانی حقوق کے نام نہاد ڈراما سے مغرب کو یہ استحقاق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ کسی بھی ملک کے اندرونی سیاسی معاملات میں دخل اندازی کر سکتا ہے اور اس کو اس بنیاد پر ایک دہشت گرد ریاست قرار دے کر اپنے اتحادیوں کو ساتھ ملا کر سزا دینے کا حق دار ٹھہرا سکتا ہے جہاں انسانی حقوق پر زد پڑتی ہو۔ اس سلسلے میں مغرب پاکستان اور اسلامی ممالک کی اسلامی اقدار کو بھی بنیادی حقوق کے مخالف تصور کرتا ہے جس میں خواتین کے نقاب کرنے کو مغرب نے سیاسی ڈراما کے طور پر استعمال کیا ہے۔

سلیم امریکہ جیسے ملک میں بھی اپنے ملک کی سہانی یاد سے غافل نہ رہا۔ اس کو پاکستان شدت سے یاد آتا۔ پاکستان کے چار موسموں کو یاد کرتا ہے ۔ایک میں پیار بویا جاتا ہے تو عشق کی فصل تیار ہوتی ہے، دوسرے موسم میں حسن بویا جاتا ہے تو رومان پیدا ہوتا ہے ،تیسرے میں شیرینی بو کر سُر کاٹے جاتے ہیں جبکہ آخری موسم جذبوں کا ہے جس میں گُلِ اخلاص پھوٹتا ہے۔ میرے ملک میں محبت ہی محبت ہے اس محبت کو دیکھنے کے لئے غیر ملکی پرندے بھی سائبیریا اور روس سے آتے ہیں، میرا ملک کا آسمان بھی مہربان ہے جو ہر کسی کو سہلانے اور بہلانے اتر آتا ہے ۔میرے ملک کے ہمسائے بھی اس قدر آپس میں محبت سے رہتے ہیں کہ ایک دوسرے کو کچھ نہ کچھ کھانے کو بھیجتے رہتے ہیں۔ میرے ملک میں لوگ گلے ملتے نہیں تھکتے ہیں، ہمارے بزرگ مرتے ہیں تو ستارے بن کر آسمان پر چمکنے لگتے ہیں۔ جینی اس عرضی جنت کے نقشے میں پورے طور پر گم ہو چکی تھی۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

موجودہ دور کو اس لیے میڈیا کا دور کہا جاتا ہے کہ مغرب محض موثر اور طاقتور میڈیا کے ذریعے ہی تیسری دنیا کے حکمرانوں اور عوام کے ذہنوں پر حکومت کر رہا ہے۔ ایسے ممالک جہاں سیاسی شعور کا فقدان ہے، جہالت ہے، اور تعلیم یافتہ مغرب کی ہر بات اور کام کو سچ سمجھتے ہیں۔ یہ تعلیم یافتہ طبقے کا احساس کمتری ہے۔ ایسے ممالک کی عوام کے لیے امریکہ نئے نئے شوشے چھوڑتا ہے۔ جس سے عوام کی سوچ بڑی حد تک متاثر ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ اس صورت میں سامنے آتا ہے کہ عوام کی سوچ کو ایک نئے رخ پر ڈال دیا جاتا ہے جس میں مغرب کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی کا دور جسمانی غلامی کا نہیں ذہنی غلامی ہے۔

سلیم نہا دھو کر باہر آیا تو میڈی کچن میں کھانا پکانے میں مصروف تھی، ریڈیو پر خبریں جاری تھیں جس پر اسامہ بن لادن کے حوالے سے کوئی پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ میڈی کچن سے باہر بھاگ کر آئی اور انتہائی غضب ناک ہو کر سلیم پر چلائی بن لادن اِن یور کنٹری، پاکستان، ناٹ ایفگانستان، میڈی نے جینی کو بھی بتایا کہ "بن لادن اِن ایبت ایبت نیئر از لام ایبت، ہز کنٹری"[۴]

تین دن تک ہاسٹل کے منیجر سمیت تمام لوگ مجھ سے دور دور رہتے اور وہی میڈی والا سوال کرتے۔ میڈی نے ساری ذمہ داری سلیم پر ڈال دی جبکہ ہاسٹل کے لوگ واقعہ کا سہارا لے کر گھما پھرا کر لیکن محتاط طریقے سے سوال کرتے:

> Dont you think, Saleem, Pakistan army knew or, may be, facilitated his stay in Abbotabad'?No. I don't think so. Had they known or facilitated it, Oh. Okay. Why do you think Obama shouldn't be mad at your government? No one should be mad at the democratically elected, government of a sovereign state.[5]

(ترجمہ: آپ کو نہیں پتا، سلیم کہ پاکستانی فوج کو معلوم تھا یا ایبٹ آباد میں اس کو قیام کی سہولت فراہم کی گئی؟ نہیں مجھے ایسا نہیں لگتا کہ وہ جانتے تھے یا سہولت فراہم کی۔ اوہ۔ ٹھیک ہے۔ آپ کو کیوں لگتا ہے کہ اوباما کو آپ کی حکومت پر غصہ نہیں آنا چاہیے؟ کسی کو جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والی خود مختار حکومت پر پاگل نہیں ہونا چاہیے۔)

چینی لڑکی 'یون' سے لے کر میڈی اور کولمبین لڑکے ہاوئیر تک سب نے سلیم سے اسامہ بن لادن کو چھپانے کا حساب مانگا۔ ان کو کیا پتا کہ سلیم کو ماسٹر صاحب نے سوالِ محبت دے کر بھیجا تھا نہ کہ سوال سیاست۔ تمام لوگ سلیم سے دور دور رہنے لگے۔ میڈی ڈر کر اکیلے کچن میں نہ جاتی، سلیم کے ڈر کی وجہ سے چھڑی کو بھی چھپا کر رکھتی۔ ہال میں آنے والے لوگوں نے اپنا ٹائم تبدیل کر لیا۔ ایسے وقت میں کوئی ہال میں نہ آتا جب وہاں سلیم موجود ہوتا۔ ان لوگوں کے دلوں میں ایسا خوف پیوست ہو چکا تھا جیسے سلیم اسامہ بن لادن کا ہی ساتھی ہے۔ امریکی بھولی اور معصوم عوام سرکش ریاستوں کے فلسفے سے ابھی تک نابلد ہے۔ اگر یہ عوام سرکش فلسفے سے آشنا ہوتی تو سلیم کو سانحہ ۱۱/۹ کے بعد اس نفرت اور تعصب کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ سرکش ریاستوں کے فلسفے کو سمجھنا ضروری ہے:

> سرکش ریاست کا فلسفہ اس وقت بھی مروج رہا کہ جب ڈیموکریٹس وائٹ ہاؤس میں دوبارہ آئے۔ صدر کلنٹن نے ۱۹۹۳ء میں اقوام متحدہ کو اطلاع دی کہ امریکہ جب ممکن ہوا کثیر فریقی، مگر جب ضروری ہو ایک طرفہ اقدام کرے گا۔ ایک سال بعد اقوام متحدہ کی سفیر میڈیلین نے اس موقف کو دہرایا۔ جبکہ ۱۹۹۹ء میں وزیر دفاع ولیم کوہن نے بھی، جس نے اعلان کیا کہ امریکہ نے اپنے مفادات کا دفاع کرنے کے لئے 'یک طرفہ

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

فوجی طاقت استعمال کرنے کا عزم کیا ہوا ہے۔ جس میں 'کلیدی مارکیٹوں، توانائی کی رسد اور تزویراتی وسائل تک آزادانہ رسائی کو یقینی بنانا شامل ہے اور بلاشبہ ہر وہ شے کہ جس کا تعین واشنگٹن اپنے 'داخلی دائرہ اختیار' میں کر سکتا ہے۔(6)

سانحہ ۹/۱۱ کے بعد امریکی میڈیا پر پھیلائی گئی نفرت اور تعصب کی بناء پر اب سلیم بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ امریکی میڈیا نے ماسٹر کے سوال 'محبت کہاں ہے' کی اہمیت ختم کر کے ایک نئے سوال کو جنم دیا کہ تہذیبوں کا تصادم کیسے شروع ہوتا ہے؟ اسلامی ملکوں میں دہشت گردی کا الزام کیسے عائد کرنا ہے۔ پاکستان کو دہشت گردوں کی آماجگاہ کس طرح بنایا جائے۔ امریکی اور یورپی میڈیا نے لوگوں کے ذہنوں پر یہ سب کچھ ثبت کر دیا۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت کا زہر میڈیائی پروپیگنڈا کے ذریعے نقش کیا گیا ہے۔ میڈیا کے ذریعے کس طرح ذہنوں کو ہائی جیک کیا جاتا ہے اس کو سمجھنے کے لیے اس عبارت کا مطالعہ ضروری ہے:

> It is true that the media prioritizes the news in term of headlines and placement of stories. But it is equally true that people pay greater attention to stories of personal interest to them and their groups. Indeed, it would be true to say that the media often 'reflect' rather than 'set' the agenda. Individuals, groups, institutions, political parties, and governments-all have their own agenda, and they lobby hard to set the are all ways of getting informed. Media does it for the masses. (7)

(ترجمہ: یہ درست ہے کہ میڈیا خبروں، سرخیوں اور کہانیوں کو ترجیح کے لحاظ سے اہمیت دیتا ہے۔ لیکن یہ بھی اتنا ہی سچ ہے کہ لوگ اپنی اور ان کے گروہوں کی ذاتی دلچسپی کی خبروں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ یہ کہنا درست ہو گا کہ میڈیا اکثر ایجنڈا مخصوص کرنے کی بجائے انعکاس کرتا ہے۔ افراد، گروہوں، اداروں، سیاسی جماعتوں اور حکومتوں کا اپنا اپنا ایجنڈا ہوتا ہے اور وہ معلومات حاصل کرنے کے تمام طریقوں سے اثر انداز ہونے کی سخت کوشش کرتے ہیں۔ میڈیا یہ سب عوام کے لیے کرتا ہے۔)

سانحہ ۹/۱۱ کے بعد سلیم کے لئے اب بھی ایک امر اطمینان بخش تھا کیوں کہ باقی سب لوگ جتنے دور ہوئے ان کی محبت جینی اتنی ہی سلیم کے قریب ہو گئی۔ سلیم اب بہت ہی کم اپنے کمرے سے باہر نکلتا، اس لئے خود جینی اس کے کمرے میں آتی۔ جینی سلیم سے کہتی کہ اس کو زیادہ سے زیادہ ڈائننگ ہال میں جانا چاہیے تا کہ لوگ اس کی افسردگی کو اسامہ بن لادن کے مرنے پر سوگ سے تعبیر نہ کریں۔ ان سب لوگوں میں صرف جینی ہی پروپیگنڈا کے مفہوم سے آشنا تھی جو سلیم کو سمجھاتے ہوئے کہتی کہ سلیم اس نفرت اور تعصب کی وجہ صرف میڈیا ہے۔

جینی کی بات میں شک نہیں ہے کہ ایسے موقعوں پر امریکی میڈیا سیاست اور مذہب کی تلخ اور ترش گولی کو میڈیا کے پروپیگنڈا کی چینی میں مکس کر کے عالمی منڈی میں لاتا ہے۔ جس سے عوام امریکہ کے سیاسی فتور کو سمجھنے سے بالکل قاصر رہتی ہے ذہن میں ذرا سی درست بات کا امکان تک پیدا نہیں ہوتا:

> "یہ معاملے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ اقتدار کے مخروطی ڈھانچوں کی طرف سے عوام کی سوچ کو اپنے نقطہ نظر سے ہم قطار کرنے کی مہم کے باعث ان نزاعی مسائل کو مسخ کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس وقت

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

بہترین موقع ہے کہ ہم ان آدرشوں اور ان بصائر کی بات کریں جنہیں اس طرح شکل بگاڑ کر پیش کیا جارہا ہے کہ ان کا حقیقی مفہوم ہی بگڑ کر رہ گیا ہے۔ سارے آئیڈیل اور سارے خواب ترمیم یافتہ شکل میں اس طرح پیش کئے جارہے ہیں کہ سچ پر جھوٹ اور جھوٹ پر سچ کا گماں گذرتا ہے۔ صنعتی معاشرے جدید دور کے اس مرحلے پر پہنچ کر جمہوریت، انسانی حقوق اور حتیٰ کی معاشی منڈیوں کو بھی نشانہ بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اور دکھ کی بات یہ ہے کہ ان اقدار کی باتیں بھی وہی لوگ بڑھ بڑھ کر رہے ہیں جو کہ ان اقدار کی تباہی کے ہراول دستے میں شامل ہیں۔ اس گھناؤنے عمل کی داد تو وہی لوگ دے سکتے ہیں جو پرانے وقتوں کے "پراپیگنڈے" سے واقف ہیں۔"(۸)

جینی کے کہنے پر سلیم اگلے دن ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے گیا تو ان کو اپنے ہی شاگرد کے تلخ جملے کا سامنا کرنا پڑا۔ سلیم نے جینی سے مچھلی اور سلاد کا آڈر کہنے کو کہا تو اس پر ان کے شاگرد نک نے کہا 'I Thought Muzlims don't eat fish' نک کی جہالت امریکی میڈیائی پروپیگنڈا کے سبب تھی۔ "نِک" جس چینل کی خبروں کو سنتا اُس کا نام بھی 'Fax' تھا۔ چینل نام سن کر ہال میں ایک شخص نے زور کا قہقہ لگایا اور کہا 'As if others are any good. Oh, my fu**ing, American media will drive us all crazy'(9)۔ ایسے میں سانحہ ۹/۱۱ کے بعد یورپ میں مسلمانوں سے نفرت کے بیانیہ کا جنم لینا حیرت کی بات نہ تھی۔

محبت قربانی مانگتی ہے۔ سلیم محبت کے اس اصول کو بھول بیٹھا تھا کہ محبت فنا ہونے کا نام ہے۔ اس لئے سلیم نے جینی کو دعوت اسلام دی تو جینی کی محبت ایک دم نفرت میں تبدیل ہو گئی اور سوالوں کا ایک لامتنائی سلسلہ شروع ہو گیا کہ آپ کیوں مجھے جنت میں لے کر جانا چاہتے ہیں۔ کیوں آپ مجھے خود کش بمبار بنانا چاہتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں ڈر اور خوف تھا کیونکہ سلیم نے ساسا کی موت پر کہا تھا کہ وہ ساسا کے مرنے پر نہیں رویا بلکہ وہ تو اس غیر مساوی تقسیم پر رویا تھا جو امریکہ اور یورپ نے پیدا کی ہوئی ہے۔

مغربی میڈیا کے ذریعے ایک پرانی اصطلاح کو استعمال کیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ متروک اصطلاح سارے مغرب میں مقبول ہو گئی۔ یہ اصطلاح "بنیاد پرستی" ہے۔ جب کی مسلم دنیا میں بنیاد پرستی کا مفہوم وہ نہیں جس کو مغرب نے اپنے مفاد کے لیے منفی طور پر استعمال کیا ہے۔ مسلم ممالک میں اس اصطلاح کا مفہوم اسلامی عقائد پر عمل کرنا ہے۔ اب ہر مسلمان جو نماز ادا کرے گا، زکوۃ دے گا، روزے رکھے گا اور ایسی خواتین جو نقاب کریں گی، مغربی میڈیا اس کو بنیاد پرست کہہ گا۔ یہ سب اصطلاحات افغانستان پر حملہ کے وقت استعمال ہونا شروع ہوئیں۔ "ساسا" میں کرداروں کے ذریعے مابعد ۹/۱۱ کی عصری صورت حال کو بیان کیا گیا ہے، سیاست اور میڈیا کے مخفی پروپیگنڈا کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ مشرق اور مغرب کے تضادات، اسلام اور مغرب کی کشمکش، یورپی لوگوں کا تارکین وطن سے ناروا سلوک، نفرت، تعصب، تیسری دنیا کے حکمرانوں کی بے حسی اور لوٹ مار، جیسے اہم عصری حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔ کردار عصری عہد کے مفہوم کا استعارہ ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ناصر عباس نیّر، پیش لفظ: ساسا، شیراز دستی، محمد، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۴، ۳

۲۔ محمد شیراز دستی، ساسا، ص۶

۳۔ ایضاً، ص۷

۴۔ ایضاً، ص۱۲۸

۵۔ ایضاً، ص۱۲۹

۶۔ ناوم چومسکی، سرکش ریاستیں، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص۲۳، ۲۲

۷۔ سیمہ حسن، *Mass Communication: Principles and Concepts*، سی بی ایس پبلشرز، دہلی، ۲۰۲۱ء، ص۱۲۶، ۱۲۷

۸۔ چومسکی، ناوم، ورلڈ آرڈر کی حقیقت، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۱۱۳، ۱۱۲

۹۔ شیراز دستی، ڈاکٹر، ساسا، ص۱۳۳

References in Roman Script:

1. Nasir Abbas Nayyar, pash lafz: sasa, aks Publications, Lahore, 2018, P.3,4
2. Muhammad Sheeraz Dasti, Dr, sasa, P.6
3. Ibid P.7
4. Ibid P.128
5. Ibid P.129
6. Noam Chomsky, Sarkash Riyastein, jamhori Publications, Lahore, 2009, P. 22,23
7. Seema Hassan, Mass Communication: Principles and Concepts,SBS Publisher, New Dehli , 2021, P. 126, 127
8. Noam Chomsky, World Order ki Haqeeqat, jamhori Publications, Lahore, 2014, P. 112, 113
9. Muhammad Sheeraz Dasti, Dr, sasa, P.133

Dr. Muhammad Sohail Iqbal completed his Ph.D. degree in Urdu from International Islamic University Islamabad, Pakistan. He has authored over 10 articles published in esteemed journals. His current research interests include Urdu fiction.

Dr. Tahira Ghafoor, a Lecturer of Urdu at Government Graduate College, Satellite Town, Rawalpindi, Pakistan, holds a Ph.D. degree in Urdu. Her primary areas of interest are Urdu fiction, especially Urdu Novel. She has contributed to the field with 11 published articles and has authored one book, showcasing her expertise and dedication to advancing Urdu literature.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

تحقیقی و تنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 20th Feb, 2024 | Accepted: 16th June, 2024 | Available Online: 30th June, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i01.391

ناسٹلجیا کے تناظر میں ناول "آگے سمندر ہے" کا مطالعہ

A Study of the Novel "Aagy Samadar Hai" in the Perspective of Nostalgia

SAQLAIN AHMAD KHAN (SAQLAIN SARFRAZ)[1] AND MUHAMMAD BURHAN HASSAN[2]

[1] Lecturer Urdu, Islamia University Bahawalpur, Pakistan

[2] Visting Lecturer Urdu, Government College University Lahore, Pakistan
Corresponding author: Muhammad Burhan Hassan (mianburhanhassan@gmail.com)

ABSTRACT The memories of the past, called nostalgia in terms of literature, can be the primary motivation for human life. A lot has been written about it in the literature; nostalgia also has profound effects on Urdu literature. Those who directly experienced the division of the subcontinent have made it the subject of their writings. There are many effects of nostalgia in the novel “Aagy Samandar Hai” How the partition destroyed the houses and then how the people tried to rebuild them, what mental agonies they went through, how many psychological and physical difficulties they faced in leaving the land of their ancestors, and What is the tragedy of memory. All of this has been tried to be considered in this article.

Keywords Novel, Nostalgia, Partition, Memories of childhood, Psychological, Ancestors, Fear.

جب سے دنیا معرضِ وجود میں آئی ہے، ہر گزرنے والا دن یاد میں تبدیل ہوتا جارہا ہے۔ ہر وہ چیز جو انسان سے تعلق رکھتی ہے، کسی نہ کسی طرح انسان کے تحت الشعور میں بیٹھ جاتی ہے۔ ہر تخلیق کار اپنے فن پارے میں کہیں نہ کہیں اپنے ماضی میں پیش آنے والی واردات، تجربات اور حادثات کو الفاظ کے ذریعے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے، اور اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو تمام تواریخ ماضی اور یادداشت کے ارد گرد گردش کرتی ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے کہ انسان اپنی جائے پیدائش، بچپن، لڑکپن، عزیز و اقارب علاقہ اور دیگر تمام اشیاء جو اس سے تعلق رکھتی ہیں ان چیزوں کو وہ تادم آخر یاد رکھتا ہے۔

ماضی کے لمحات کو میسر لمحے میں دریافت کرنا ناسٹلجیا کہلاتا ہے۔ علم نفسیات میں یہ اصطلاح نفسیاتی و ذہنی امراض میں مبتلا مریضوں کے علاج کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ ایسا مرض ہے جس میں مریض اپنے ماضی کی کرب ناک یادوں میں مبتلا ہو کر حال میں ماضی کو تلاش کرتا ہے۔ ہر انسان اپنے ماضی سے جڑا ہوا ہے۔ اور اپنے حال کو ماضی کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ ماضی کے خوشگوار یا ناخوشگوار احساس سے دامن چھڑانا ممکن نہیں ہوتا۔ بعض اوقات انسان تو جیتے ہی ماضی میں ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ ماضی حال کو جینے کا ایک ایسا خوش گوار عمل ہے، جس کی بدولت حال کا سفر آسان اور مستقبل کی امید قوی ہو جاتی ہے۔ ہر انسان اپنی زندگی میں سوچے

This work *is licensed under a* Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

سمجھے بغیر بہت سی کیفیات اور احساسات کو جذباتی طور پر محسوس کرتا ہے۔ اچھے برے ہر دور کا تعلق ماضی اور حال سے ہو سکتا ہے۔ناسٹلجیا ماضی کا حسین عکس لیے انسان کا پیچھا کرتا ہے اور پھر اچانک اس کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ناسٹیلجیا بیک وقت اپنے اندر کئی معنی لیے ہوئے ہے۔ گزرے وقت کی یاد، وطن پرستی، وطن سے دوری کا احساس کسی مقام یا گزرے لمحوں کی باز آفرینی وغیرہ۔ اصطلاحی طور پر اس کا مطلب ماضی پرستی یا ماضی پسندی کی ایسی شدید خواہش جس کو فراموش کرنا ناممکن ہو اور جو اپنا تاثر قائم رکھے اور جذبات واحساسات میں ظاہر ہو وہ ناسٹلجیا ہے۔ انسان نے تو موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک اور دنیا بسا رکھی ہے۔ جو ماضی کے خواب وخیال اور واقعات وحادثات پر مبنی ہے۔ احمد سہیل ناسٹلجیا کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "ناسٹلجیا کا مفہوم غالباً ہمارے ہاں خانہ اداسی سے لیا جاتا ہے۔ جو یکسر غلط ہے۔ خانہ اداسی سے مراد Home sickness ہے۔ ناکہ ناسٹلجیا جو بظاہر لاطینی لفظ معلوم ہوتا ہے۔ حقیقتاً ناسٹلجیا دو یونانی الفاظ Notos بہ معنی واپسی اور Algos جس کے معنی درد کے ہیں، سے مل کر بنا ہے۔ لفظی طور پر ناسٹلجیا کے معنی درد آلود واپسی کے ہیں۔ اس اعتبار سے لفظ ناسٹلجیا کو ہم پس کربیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ کرب ماضی کی جانب واپسی سے مشروط ومنسوب ہے۔"(۱)

ناسٹلجیا کو نفسیاتی عارضہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ اردو ادب میں اس نفسیاتی اصطلاح کو ترقی پسند مصنفین بیماری کہتے ہیں۔ اور اسے ایک ادبی رجحان تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے نزدیک ہر وہ شاعر یا ادیب اپنے حال سے ناخوش ہوتا ہے۔ اور جنہیں مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ وہ اپنے ماضی میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اس کو ناسٹلجیا کہتے ہیں۔ ویسے تو یہ اصطلاح بھی مغرب کی عطا کردہ ہے اور مغربی ادیبوں نے اس اصطلاح کا سہارا لیتے ہوئے اپنا کتھارسس بھی کیا ہے۔ نوبل انعام یافتہ ادیب "گیبریل گارشیا مارکیز" ناسٹلجیائی فضا کا ذکر کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

> "دوستی کے بے شمار ناقابلِ تصور اسباب ہو سکتے ہیں مجھے ایسے بہت سے مشہور لوگوں کو جاننے کا موقع ملا جن سے تنہائی کے سو سال پہلے میری ملاقات کا امکان نہیں تھا اور مجھے یہ کسی اور سبب سے نہیں بلکہ صرف ان کی شہرت کے سبب مل سکا بعد میں ہم ایک ایسی یگانیت کے سبب دوست ہو گئے جس کا میری یا ان کی شہرت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس لحاظ سے شہرت ایک مثبت چیز ہے۔ یہ دوستی پیدا کرنے کے ایسے قابلِ قدر مواقع فراہم کرتی ہے جو اس کے بغیر میسر نہیں آسکتے اس کے باوجود اور اپنے دوستوں سے اتنے لگاؤ کے باوجود میں تنہائی کے سو سال سے پہلے کے اپنے دوستوں کو ایک الگ گروہ خیال کرتا ہوں یہ ایک قسم کی خفیہ تنظیم ہے جسے ایک مشترکہ ناسٹلجیا لافانی طور پر یکجا کیے ہوئے ہے۔"(۲)

اردو ادب میں ناسٹلجیائی رجحان کی توجیہہ نفسیات میں ہی پیش کی جاتی ہے۔ کہ ادیب اپنی بیماری کو فن کے اظہار کے ذریعے سے ناسٹلجیا کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے، کہ اسے درست تسلیم کیا جائے۔ اردو شاعری میں کم وبیش ہر شاعر کے ہاں ماضی پرستی کے رجحانات ملتے ہیں۔ لیکن جن شعراء کے ہاں ماضی پرستی کا رجحان غالب رہا ان میں میر تقی میر، غلام ہمدانی مصحفی، اسد اللہ

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

خان غالب، مومن خان مومن، حسرت موہانی، فراغ گورکھپوری، جگر مراد آبادی اور اختر انصار دہلوی کے نام نمایاں ہیں۔ جبکہ قیام پاکستان کے بعد کے شعراء میں ناصر کاظمی، احمد مشتاق، منیر نیازی، فیض احمد فیض، مجید امجد، باقی صدیقی اور ن۔م راشد ایسے نام ہیں جن کے ہاں ناسٹلجیائی کیفیات کی فراوانی ملتی ہے۔

اسی طرح اردو نثر لکھنے والوں کے ہاں بھی ناسٹلجیائی رجحان ملتا ہے۔ اور جن اردو نثر نگاروں کے ہاں یہ رجحان زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ ان میں پریم چند، احمد علی، محمود ظفر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چند، عزیز احمد، رام لعل، قراۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے نام نمایاں ہیں۔ تقسیم برصغیر ایک ایسا واقعہ تھا۔ جس نے زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام شعبہ جات کے ساتھ ساتھ اردو نثر اور اردو شاعری کو بھی متاثر کیا۔ جن ادبا نے تقسیم کا براہ راست تجربہ یا مشاہدہ کیا ان سب کے ہاں ہمیں ہجرت کے بڑے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ادیبوں کی تحریروں میں ہمیں تقسیم کا کرب محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح دورِ حاضر کے معروف ناول نگار انتظار حسین کی بات کی جائے تو وہ بھی بار بار ماضی سے اپنے آپ کو کھوجتے ہیں اور اپنے مخصوص انداز میں اپنی جڑوں کو تلاش کرتے ہیں۔ اس غرض کے حصول کے لیے وہ مخصوص علامتوں کا سہارا لیتے ہیں انتظار حسین حقیقت اور خیال کو مجسم کر کے ہمارے سامنے ایک انوکھے انداز میں دنیا کی حقیقت اور قیمتی یادوں کو جدید طرز پر ناول میں پیش کرتے ہیں۔ ماضی کی خوبصورت یادوں میں کھو کر حال اور مستقبل کی کڑیوں کو آپس میں ملاتے ہیں۔ جس رنگ کو جس طرز کو اور جس روایت کو بانو قدسیہ نے راجہ گدھ میں قرۃ العین حیدر نے ناول آگ کا دریا اور کار جہاں دراز میں زندہ رکھا اسی روایت کو انتظار حسین نے اپنے ناول بستی، تذکرہ اور آگے سمندر ہے میں برقرار رکھا۔ یہ وہ ادیب تھے جن کو براہِ راست ہجرت کا تجربہ ہوا اور پھر ساری زندگی اسی تجربے کے سائے میں فن کو تخلیق کرتے رہے ۔ معروف نقاد احمد ہمدانی انتظار حسین کے ناسٹلجیا کے بارے میں عمومی طور پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "وہ تمام انکشافات اور مشینی ایجادات کو ذہنِ انسانی کا کارنامہ سمجھنے کے بجائے انسانیت کی پستی سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی کوٹھری اور کوٹھری کے باہر کی فضا میں ربط دینے کو ضرورت کا نظر انداز کر کے صرف ماضی کی چھاؤں میں سستانے بلکہ سو جانے کو کافی سمجھتا ہے۔"(۳)

انتظار حسین کے ناول "آگے سمندر ہے" کو ناسٹلجیا کے تناظر میں دیکھا جائے، جو کہ ان کے پہلے ناول بستی کی ہی توسیع شدہ شکل ہے تو ناول "آگے سمندر ہے" کی کہانی، اس کے کردار مکمل طور پر ناسٹلجیک فضا میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناول کی کہانی حقیقت اور مصنف کے ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار جواد ماضی کی یادوں کو ایک بار پھر سے جینے کی خاطر اپنے آبائی وطن کا سفر کرتا ہے تاکہ وہ ان سب یادوں کو ایک دفعہ جی بھر کے جی سکے، محسوس کر سکے۔ اپنی ان "فرسودہ" یادوں کو پھر سے تازہ کر سکے۔ ناول کا مرکزی کردار ان تمام خوبصورت یادوں کو جو کہ اس کے لاشعور میں ہر وقت ایک خوبصورت احساس کے طور پر ابھرتی رہتی تھیں اُن کو پھر سے جینے کی خاطر ان یادوں کو اکٹھا کرنے کی خاطر آبائی وطن کا سفر کرتا ہے۔ ناول کی کہانی تاریخ اور سیاسی صورت حال سے جڑی ہوئی ہے مرکزی کردار جواد (براہ راست تقسیم کا تجربہ کار) قیام پاکستان کے وقت ہندوستان سے پاکستان میں آبسا ہے اور یہاں زندگی گزارنے کے لیے اس نے کراچی جیسے جدید شہر کو چنا ہے، جس میں ناول دارالحرب کی کیفیت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یعنی اس شہر

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

میں قتل وغارت چوری، ڈاکے اور گولیوں دھماکوں کی آوازوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قرطبہ، غرناطہ جیسے شہروں کی تاریخ کو اس سے جڑے واقعات اور یادوں کو پورے ناول میں مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے اس ناول میں اکثر کرداروں سے جواد اپنے ماضی کے قصے بیان کرتا ہے۔ ایک دوسرا بڑا کردار اس ناول میں مجید الحسینی عرف مجو کا ہے۔ جو کہ جواد کے ساتھ فلیٹ میں رہتا ہے مجو کے بہت سے لوگوں سے تعلقات ہیں اور وہ ایک آزاد طبیعت کا شخص ہے۔

اس ناول میں جواد کو ماضی کی تلخ وشیریں یادیں ستاتی رہتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے ایک یاد دوسری یاد کو اپنے اندر نگل رہی ہے۔ یہ ناول اسلامی ممالک کے کھوئے ہوئے اسلامی دائرے کے وژن کے ساتھ معاصر کراچی کے شہری زندگی اور پُر تشدد حالات کا موازنہ کرتا ہے۔ مصنف نے کراچی میں رہنے والے مہاجرین کی زندگی کو پیش کیا کہ کس طرح ماضی کے قصے ان کی ذات کو کھوکھلا بنا رہے ہیں۔ ناول آگے سمندر ہے میں ہمیں انتظار حسین کے باقی ناولوں کے برعکس ایک الگ منظر نامہ ملتا ہے۔ اس ناول میں لوگوں کی اس حالت کو بیان کیا گیا ہے جب قیام پاکستان کو اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی لوگ کراچی جیسے شہر میں اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مہاجر لوگ مکمل طور پر اس نئی زندگی کو اپنا نہیں سکے اتنے بڑے شہر میں بھی وہ خود کو اکیلا ہی محسوس کرتے ہیں۔ یہ لوگ جب بھی اپنے جیسے مہاجر سے ملتے ہیں، ملاقات کرتے ہیں، تو ماضی کو سوچ کر اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو اپنی روایات اور رشتوں کی پامالی کو یاد کر کے افسردہ ہو جاتے ہیں۔

جدید دور میں بھی ناول کے کردار اپنے ماضی سے جڑے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی کوئی واقعہ رونما ہوتا، ہر کردار اپنے ماضی کی یادوں میں گم ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انتظار حسین نے ناول میں جدید دور کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی مسائل کو بھی ماضی کی یاد سے جوڑا ہے۔ ناول کا آغاز انتظار حسین نے احمد مشتاق کے ایک خوبصورت شعر سے کرتے ہیں۔ جو بڑی معنویت کا حامل ہے۔

وہی گلشن ہے لیکن وقت کی رفتار تو دیکھو
کوئی طائر نہیں پچھلے برس کے آشیانوں میں

اس شعر میں بھی یاد ماضی، وقت کی رفتار اور بچھڑے ہوؤں کی یاد پر افسردگی کا اظہار شامل ہے۔ ناول میں ناسٹلجیائی فضا کا آغاز تو انتظار حسین یہاں سے ہی کر دیتے ہیں۔ ناول میں سارے واقعات ایسے ہی ملتے ہیں، جو ماضی پرستی کی گواہی ہیں۔ ناول کے پہلے جملے میں ہی گزرے زمانے کا ذکر ہو رہا ہے یعنی آغاز ہی میں بات ماضی کے واقعات سے کی جا رہی ہے اقتباس دیکھیے:

> "یہ اصل میں اس زمانے کا ذکر ہے جب عبد الرحمن اول کے بوئے ہوئے کھجور کے درخت پر سوا دو سو برس گزر چکے تھے۔ صحرائے عرب کی حور اندلس میں رچ بس چکی تھی۔ قرطبہ اشبیلیہ، غرناطہ، طلیطلہ کے گھروں کے صحن اب اس کے اپنے گھر تھے۔۔۔۔ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور تم اسے کہاں لے گئے۔"(۴)

ناول کے آغاز میں واضح طور پر ماضی کے قصے کو یاد کیا جا رہا ہے۔ یہاں مرکزی کردار جواد پرانی باتوں کو شروع کرتا ہے، اور بات بات پہ اپنے ماضی میں گم دکھائی دیتا ہے۔ جس پر اس کا دوست مجو اسے ہر بار کی طرح ٹوک دیتا ہے۔ اور اعتراض بھی کرتا ہے کہ بات کچھ بھی ہو اس کی کڑی تم یہاں (ماضی) ہی میں جوڑتے ہو۔ جب کہ جواد کا کردار پورے ناول میں ہی اسی طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ ماضی کے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

حسین لمحوں کی یاد میں کھویا ہوا ملتا ہے۔ جواد میرٹھ کے ایک چھوٹے سے قصبے ویاس پور سے کراچی ہجرت کر کے رہائش پذیر ہوتا ہے ۔ لیکن روحانی طور پر وہ وہی اپنے چھوٹے سے قصبے ویاس پور میں زندہ رہتا ہے۔ بچپن کی یادیں اس کو ستاتی ہیں۔ ان یادوں کو وہ پھر سے جینا چاہتا ہے وہ دوبارہ اپنی جنم بھومی کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اور پھر ایک روز اسے خبر ملتی ہے کہ ہندوستان میں رہ جانے والی اس کی پھوپھی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس طرح اسے اپنے وطن واپس جانے کا ایک بہانا مل جاتا ہے۔ جواد اپنی جنم بھومی کا سفر شروع کرتا اور ان گنت یادوں کو تازہ کرتا ہے، لیکن اس کا یہ تجربہ خوشگوار ثابت نہیں ہوتا۔ گاؤں کی صورتحال بدل چکی تھی۔ پرانی حویلیوں کی جگہ جدید گھروں نے لے لی تھی، گاؤں کی قدریں زوال آمادہ تھیں، مانوس چہروں کی جگہ نئے چہرے آباد ہو چکے تھے۔ جواد کا یہ سفر ناول کی فضا کو ناسٹلجیا سے پُر کر دیتا ہے۔ جواد کا ہندوستان میں اپنے گھر پہنچ جانے اور پہلی رات گزارنے تک کا سفر کافی تکلیف دہ رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ بچپن کی یادیں تازہ ہونے لگتی ہیں۔ مثلاً اقتباس دیکھیے کہ:

> "میرے ساتھ یہی ہوتا ہے، لگتا ہے کہ مجھے پچھلی کوئی بات یاد نہیں ہے مگر کسی کسی وقت یادیں اس طرح امنڈتی ہیں کہ میں ان میں بہتا چلا جاتا ہوں۔" (۵)

اس اقتباس میں ناول کا مرکزی کردار خود اپنے اندر کے ناسٹلجیائی رویے کا اظہار کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ کس طرح چھوٹی چھوٹی یادیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی اکثر تو یادیں غائب ہو جاتی ہیں لیکن اچانک ہی یادوں کا ایک پنڈورا باکس کھل جاتا ہے۔ ہجرت کے وقت جواد کو اپنی محبت کی بھی قربانی دینی پڑی تھی۔ اب جب کہ وہ ہندوستان واپس لوٹا ہے، تو اس کی وہ یادیں حسین لمحے دوبارہ تازہ ہو گئے ہیں۔ یہاں پہ "میمونہ" سے دوبارہ ملاقات جواد کو پھر سے ماضی میں لے جاتی ہے۔ میمونہ کے ساتھ گزرا وقت دوبارہ سے جواد کے نہاں خانوں میں تازہ ہو جاتا ہے۔ وہ بچپن کے دن جو انہوں نے ساتھ گزارے تھے۔ وہ باتیں، وہ کھیل، وہ کھانے، سب تہوار ایک حسین منظر کی طرح پھر سے اس کے ذہن کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے کہ:

> "ایک برسات، دوسری، تیسری برسات ایک دم سے ہمیں کتنی برساتیں اکٹھی یاد آگئی تھیں۔، جیسے گہری گھٹا امڈ آئی ہو۔ یادوں کی گھٹا بھی کتنی ظالم گھٹا ہوتی ہے۔ ہم جیسے پھر سے بچے بن گئے ہوں۔ میمونہ اور منن جواد کا (Nick Name) ایک دوسرے کی انگلی پکڑے کہاں سے کہاں نکل گئے۔ اس دن کتنی بارش ہوئی تھی۔" (۶)

مندرجہ بالا اقتباس میں بچپن کی یادوں کا گہرا عکس دیکھا جا سکتا ہے، جس نے ہندوستان پہنچتے ہی جواد کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ اس سارے ناول میں جواد ان یادوں کو منظر عام پر لاتا ہے۔ جو کہ اس کے لاشعور میں موجود تھیں۔ جن کو جواد خود میں اکٹھا کرنا چاہتا تھا ۔ لیکن ماضی میں گزری کچھ ایسی یادیں بھی تھیں۔ جن کو وہ دوبارہ اپنی جھولی میں سمیٹ نہ سکا، کیونکہ حالات کروٹ لے چکے تھے۔ وقت کی رفتار تیز تر ہو چکی تھی۔ ننگ و افلاس نے جگہ جگہ ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ جس وجہ سے وہ پیار، محبت اور سکون جو پہلے تھا۔ اب وطن کی مٹی سے وہ سب محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ جس مٹی سے اس کو ماں جیسی ممتا کا احساس ہوتا تھا۔ اب اس میں وہ خوشبو باقی نہیں رہی تھی ۔ جن یادوں کو وہ دوبارہ سمیٹنا چاہتا تھا۔ جن کو سوچ کر وہ بے قرار ہو جایا کرتا تھا۔ اب انہی گھروں کھیتوں اور لوگوں کو دیکھ کر اس کے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

تاثرات میں حیرت انگیز مایوسی شامل ہو رہی تھی۔ کیونکہ راوی خود ناول میں اپنی اس حالت کو بیان کرتا اور کہتا ہے۔ اب یہ علاقہ، اب یہ میرٹھ وہ میرٹھ نہیں رہا جس میں میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔ میرٹھ جس دھرتی پر جواد نے جنم لیا تھا۔ اس زمین پر واپس لوٹنے پر اس کی پہچان اب یہ رہ گئی تھی کہ وہ پاکستان سے آیا ہے۔ یہ وہ جواد ہے، جو پاکستان سے آیا ہے یہاں ہندوستان میں جواد نے وقت کا بہاؤ محسوس کیا تھا کہ وقت کس تیزی سے گزرا ہے، کتنے ہی جوانوں کو بڑھاپے نے گھیر لیا ہے۔

اس ناول میں ماضی کی یاد ماضی کے قصے ماضی کے احساسات کو محسوس کرنے کی خاطر انتظار حسین نے واپسی کا سفر کروایا۔ لیکن اس سفر میں جواد کو جہاں خوشی محسوس ہوئی اپنی دھرتی کو عرصے بعد دیکھ کر تو اس خوشی پر مایوسی کا غلبہ بھی چھایا رہا اور اس غلبے کے ساتھ جواد واپس پاکستان لوٹا۔ یہاں دیکھتا ہے تو حالات یہاں بھی کشیدہ نظر آتے ہیں۔ جواد حیران ہوتا ہے، کہ وہ اتنا وقت وہاں گزار آیا کہ وقت نے دوڑ ہی لگا دی۔ اور شہر کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ خیر یہ حیرت تو جواد کو کچھ دن بعد ہوئی۔ جب وہ میرٹھ کے سحر سے نکلا لیکن واپس آجانے کے بعد بھی ہندوستان اس کے حواس پر چھایا رہا۔ اقتباس:

> "واپس آنے کے بعد کچھ دنوں تک میں اسی سحر میں رہا۔ لگتا تھا کہ ابھی وہیں ہوں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ خواب دیکھتے دیکھتے اچانک آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ تو کھل گئی مگر ذہن ابھی تک اسی فضا میں بھٹک رہا ہے۔"(۷)

اس ناول میں صرف جواد ہی ناسٹلجیا کا شکار نظر نہیں آتا، بلکہ میمونہ (مونہ) اور "بڑی بھابی" کے علاوہ "چھوٹی پھپھی" کا کردار بھی ناسٹلجیا میں گھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ فطری طور پر انسان اپنی زندگی کے کسی بھی حصے کو فراموش نہیں کر سکتا، یہ کوئی ذہنی خلل نہیں بلکہ ناسٹلجیا ہے، جو ہر انسان کے ساتھ ساری زندگی چلتا رہتا ہے۔ اس ناول کا ایک حصہ تاریخ سے جڑا ہوا ہے، جس کا انتظار حسین نے دور حاضر کے حالات سے تقابل کیا ہے۔ اس تاریخی شعور کو بہترین انداز میں پیش کرنا ایک بڑا معرکہ ہے۔ جو کہ انتظار حسین کا خاصا ہے۔ تاریخ دان تاریخ کو بیان کر دیتے ہیں کہ آج سے پہلے کیا ہوا، لیکن اس تاریخ کو دور حاضر کے تقاضوں سے جوڑ کر فرق بتانا اور ایک سبق کے طور پر پیش کرنا یہ طریقہ بہت کم لوگوں نے اپنایا۔ انتظار حسین اپنے انداز میں تاریخ کے عمل میں ٹوٹتی بگڑتی تہذیبوں کے نوحہ خواں ہیں۔ یہ آہ و پکار جڑوں سے کٹ جانے کا واویلا نہیں ہے بلکہ ان کی تلاش کا عمل ہے۔ اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں سمیت اپنے ماضی کو حاصل کر لینے کی کوشش ہے۔

کراچی کے حالات کو جواد اپنے بچپن سے جوڑتا دکھائی دیتا ہے کہ آج جس طرح کا سناٹا شہر میں پھیلا ہوا ہے ایسا ہی سناٹا اس کے بچپن میں جب تک اس کی بستی میں بجلی نہیں تھی اور شام ہوتے ہی ہر طرف ہو کا عالم ہوتا تھا۔ اسی طرح جواد بتاتا ہے کہ بچپن کے سناٹے کے بعد جو سناٹا میرے تجربے سے گزرا وہ ۱۹۴۷ء کے آس پاس کے زمانے کا تھا۔ لیکن اب بھی شہر میں سناٹا ویسا ہی چھایا ہوا ہے۔ دیکھیے کہ:

> "ویسا ہی سناٹا مگر ایک نئی دہشت کے ساتھ۔ ہر عہد اپنا سناٹا اپنی دہشت اور ہاں اپنا تشدد اپنے ساتھ لاتا ہے"(۸)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

مزید ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اے یار اب تو آئے دن ہی میں اس شہر میں ایسا کچھ دیکھتا ہوں کہ میری پراگندہ خاطری بڑھ جاتی ہے۔ اور دل میں سو طرح کے اندیشے گزرتے ہیں۔ میں زمانے کی الٹ پھیر کو دیکھتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں۔"(۹)

ناول کے اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماضی کے کس سانحے کو یاد کیا جارہا ہے۔ ہجرت کا دور ہر عام انسان کے لیے تکالیف و مشکلات سے اٹا ہوتا ہے۔ اس ناول میں انتظار حسین نے اسلامی ممالک کے قانون اور اصولوں کی یاد دہانی بھی کروائی ہے۔ آج کل اسلامی ممالک اور ان کی پالیسیاں کس معاشرے کو پروان چڑھا رہی ہیں۔ آج کی مسلمان قوموں نے اپنا اصل مقام و مرتبہ کس طرح فراموش کر دیا ہے، اپنے نام و ناموس کو کس طرح ملیامیٹ کر دیا ہے۔ ناول میں مصنف نے اپنی پسندیدہ تکنیک یعنی علامتوں اور اساطیروں کا استعمال بھی کیا ہے۔ وہ اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کے زمانے کے قصے اور مثالیں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ اور اپنے عظیم بزرگوں کو بھی یاد کرتے ہیں، جنہوں نے وطن کے وقار کو قائم رکھنے کی خاطر، وطن کو بچانے کی خاطر قربانیاں دی تھیں۔ انتظار حسین نے اس ناول میں ماضی کی یادوں سے انسانی تعلق کی مضبوطی کو ظاہر کیا، جدید دور کی تیز رفتاری کے پیش نظر جن اقدار کو ہم بھول رہے ہیں ان کو دوبارہ یاد کروانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً، لکھتے ہیں کہ:

"ایک وقت کشتیاں جلانے کا ہوتا ہے۔ اور ایک وقت کشتی بنانے کا۔ وہ وقت پیچھے رہ گیا جب ہم سے اگلوں نے ساحل پر اتر کر سمندر کی طرف پشت کر لی تھی اور اپنی ساری کشتیاں جلا ڈالی تھی۔ اب بپھرتا سمندر ہمارے پیچھے نہیں، ہمارے سامنے ہے اور ہم نے کوئی کشتی نہیں بنائی۔"(۱۰)

مندرجہ بالا اقتباس ناول کا نچوڑ ہونے کے ساتھ ناسٹلجیا کی وہ کڑی بھی ہے۔ جس میں یادوں سے سبق سیکھ کر حال کو بہتر بنایا جا سکتا ہے، مستقبل کی راہیں متعین کی جاسکتی ہیں۔ پورے ناول میں ماضی کے حسین دور اور انسانیت پرستی سے بھرپور معاشرے کو آج کے دور سے جوڑنے کی کوشش کی ہے کہ یہ لوگ جو آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے ہیں۔ یہ انہی عظیم روایات کی حامل شخصیات کی نشانیاں ہیں۔ جنہوں نے وطن کی خاطر اپنی قیمتی جانوں کی قربانیاں دی تھیں۔ ہم سے پہلے آنے والوں نے شہروں کو آباد کیا تھا اور آج جدید دور کا انسان اپنی ہوس میں اپنے سکون کی خاطر پھول جیسی زندگیوں کے لیے خوف کی علامت بنا ہوا ہے۔ ناول کا بنیادی بیان کردہ مسئلہ بھی یہی ہے۔ انتظار حسین نے ناول میں ان اقدار کو اجاگر کرنے کی کوشش ہے جو ماضی کی حسین یادوں کے طور پر ہمارے پاس موجود ہیں۔ اور جنہیں جدید دور میں پیش آنے والے نئے چیلنجز کا سامنا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اب تو سمندر ہمارے عقب میں نہیں بلکہ سامنے ہے۔ جس کو پار کرنے کے لیے کوئی حکمت عملی نہیں بنائی گئی، کوئی ایسا راستہ نہیں بنایا جہاں ہم اب آنے والی نسلوں کے لیے آسانیاں پیدا کر سکیں۔ ناول کا ایک اور ضمنی کردار مرزا دلاور حسین شہر کی اس تشویش ناک صورتحال کو دیکھتے ہوئے ماضی کے واقعے (طارق بن زیاد) کو دہراتا ہے اور پھر کراچی شہر کی صورتحال کو دیکھتے ہوئے اپنی رائے پیش کرتا ہے، جو کہ دیکھا جائے تو ناول کا ایک حصہ ہے۔ لیکن اس واقعے کی طرف نشاندہی ماضی کے واقعات کو اپنی ذات کا حصہ بنائے رکھنا یہی ماضی پرستی ہے۔ اور بیشتر انسان اس فضا میں ساری زندگی کسی نہ کسی طور مقید رہتے ہیں۔ ناول کے سبھی کردار اور خاص طور پر جواد ناول میں مسلسل اپنی یادوں میں کھویا

ہوا نظر آتا ہے۔ناول کی ساری کہانی ہی ناسٹلجیائی فضا میں گھری ہوئی ہے۔ناول میں جواد اور اس کا دوست کراچی شہر کے بگڑتے حالات دیکھتے دیکھتے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔جواد کو کسی نامعلوم افراد کی گولی لگتی ہے، تو مجو بھائی بھی بم دھماکے میں شہید ہو جاتا ہے۔ یوں یادوں کا جو پنڈورا بکس پورے ناول میں جواد کے کردار کے ساتھ ساتھ چلتا آرہا تھا۔اس کے مرنے پر وہ بند ہو جاتا ہے۔چونکہ ماضی کی یادوں سے اور ماضی سے جڑے کسی بھی احساس سے انسان چاہتے نہ چاہتے ہوئے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔یادیں انسان کے شعور اور لاشعور میں زندہ رہتی ہیں، زندگی کے کسی بھی موڑ پر انسان ان یادوں میں کچھ دیر کے لیے پناہ تلاش کرتا ہے۔انسانی ذہن کبھی بھی اپنے ماضی کو فراموش نہیں کر سکتا، اور یہی ناسٹلجیائی رنگ ہمیں انتظار حسین کے ناول "آگے سمندر ہے" میں باقی ناولوں کی نسبت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔بعض لوگوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ انتظار حسین ماضی پرستی کی وجہ سے نئے ماحول میں اپنے پیر نہیں جما سکے۔اپنی اسی ذہنی کیفیت اور رویے کے بارے میں اکثر انتظار حسین کہا کرتے تھے کہ وہ ۱۸۵۷ء کے گمشدہ سپاہی ہیں۔ان کا یہ رویہ ہمیں ان کی تحریروں میں صاف دکھائی دیتا ہے۔ان کے مذکورہ ناول "آگے سمندر ہے" میں بھی وہ جدید دور میں بیٹھ کر پرانے وقت کے قصوں کو ناول میں سمیٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اس ناول میں بھی وہ خوشگوار یادوں کو دوبارہ جینے کے لیے اپنے دیس کو پلٹتے ہیں۔لیکن جس جنت کی تلاش میں جاتے ہیں وہاں وہ حاصل نہیں ہو پاتی۔ناول میں انتظار حسین قدیم سے جدید دور کے تقاضوں کا تقابل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔احمد سہیل، اردو افسانے کا ناسٹلجیا، مشمولہ، ذہنِ جدید، شمارہ ۱۰، ۱۹۹۵ء، ص ۳۲، ۳۳

۲۔گیبریل گارشیا مارکیز، منتخب تحریریں، اجمل کمال، مترجم، آرٹ پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۶۱۵، ۶۱۴

۳۔احمد ہمدانی، سلسلہ سوالوں کا، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۳۶، ۳۷

۴-انتظار حسین، آگے سمندر ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۵۰

۵۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۶۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۷۔ ایضاً، ص ۱۶۰

۸۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۹۔ ایضاً، ص ۳۰۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۰۸

References in Roman Script:

1. Ahmed Sohail, Urdu Afsany Ka Nostalgia, Mushmola , zehn -e- jaded, shumara, 10, 1995 , P. 32-33
2. Gabriel García Márquez ,Muntakheb tehrerey: Ajmal Kmal (Mutarjam), Gabriel García Márquez , Karachi, Art publications, third edition,2011,P. 614-615
3. Ahmed hamdani, silsila swalon Ka, Karachi, maktabh Aslob ,1986, P.36-37

4. Intzar Hussain, Aagy smandar ha, Lahore: sang-e-meel publications, 2016, P. 05
5. Ibid, P.132
6. Ibid, P.137
7. Ibid, P.160
8. Ibid, P.183
9. Ibid, P.304
10. Ibid, P.308

Mr. Saqlain Ahmad Khan received the M. Phil degree in Urdu. He is currently a lecturer in the department of Urdu, Islamia University, Bahawalpur. He has written 03 articles on Urdu criticism, a subject of his interest.

Mr. Muhammad Burhan Hassan completed his M. Phil degree in Urdu. He is currently working at Government College University, Lahore as a Visiting Lecturer. Over 03 articles by him have been published. His research interest includes Urdu fiction and Urdu criticism.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ دریافت

Received: 6th Feb, 2024 | Accepted: 16th June, 2024 | Available Online: 30th June, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i01.388

"بہاؤ" کے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ

A Psychological Study of the Characters of Novel "Bahao"

ALMAS AKMAL
Lecturer Urdu, M.A. Jinnah College Jhelum, Pakistan
(almas.akmal0007@gmail.com)

ABSTRACT Mustansar Hussain Tarar is a famous Urdu novelist. In this article, the desolate settlement Presented in Tarar's Novel "Bahao" and its psychological study under the on human thoughts and psychology due to the destruction of its civilization has been examined. Analysis of the character of novel is presented as a psychological study under the influence of theories such as life instinct, death instant, multiple personality disorder, narcissistic culture, Freud's theory of dream, inferiority complex, oppression, replacement, Consciousness, Un Consciousness and Nostalgia. The aim of this article is to make the student of Urdu literature understand the psychological problems faced by the characters in the story of a deserted slum.
Keywords Bahao, Characters, Psychological study, Consciousness, oppression, Nostalgia.

"بہاؤ" منفرد ناول ہے۔ منفرد اس حوالے سے کہ ناول نگار نے پانچ ہزار سال پرانی بستی کے معدوم ہونے کا نوحہ پڑھا ہے۔ پہلی مرتبہ سنگ میل پبلیکیشنز نے اسے ۱۹۹۲ میں شائع کیا۔ ۲۷۲ صفات کے اس ناول کی تاریخی اہمیت یہ بھی ہے کہ قاری ایک خوشحال بستی کو پانی کی عدم دستیابی کے باعث دن بدن ویران اور تباہ ہوتے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے سمرو کی جھجھر میں پانی کم ہونا، پاروشنی کے کنویں میں بوکے کا دیر سے پانی تک پہنچنا اور گھاگھرا کے کنارے دن بدن ایسی لکیر بننا جہاں پچھلے دن پانی تھا سب مل کر بڑی روانی اور ٹھہراؤ کے ساتھ بستی کی ویرانی کے مناظر پیش کرتے ہیں۔ ان مناظر سے قاری ان سب کھنڈرات کی ویرانی کے پس منظر میں کھو جاتا ہے جن میں کبھی زندگی چہکتی تھی اور اب محض اس کی کچھ نشانیاں باقی رہ گئی ہیں۔ ناول میں پیش کی گئی بستی کا انحصار سرسوتی کے پانی پر ہے۔ ناول کا انتساب بھی سرسوتی کے پانیوں کے نام ہے۔

"سرسوتی جو بڑے پانیوں کی ماں ہے۔۔۔۔
ساتویں ندی ہے، اس کے پانی آتے ہیں،
شاندار اور بلند آواز میں چنگھاڑتے ہوئے۔"(۱)

شاندار" اور "بلند آواز میں چنگاڑتے ہوئے" سے ناول کے آغاز میں ہی بڑے پانیوں کے لیے قاری کے دل میں ہیبت، اہمیت اور تکریم کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی کی طرح نفسیات کا ادب سے بھی گہرا رشتہ ہے۔ اگر ادب زندگی کی عکاسی کرتا ہے تو

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

نفسیات انسانی کردار کا مطالعہ اس کے ماحول کے تناظر میں کرتی ہے۔نفسیات یعنی سائیکالوجی یونانی زبان کا لفظ ہے۔ "Psychology" جس کے معنی روح ہیں اور Logy جس کے معنی گفتگو، بات اور علم کے ہیں۔ کی مناسبت سے روح کے بارے میں جو بھی گفتگو کی جائے وہ روح کا علم ہو گا اور روح کے اسی علم کو نفسیات کا نام دیا گیا ہے۔ فرہنگ عامرہ کے مطابق:

"نفسیات (نف، سی، یات) وہ علم ہے جو ان کی روحی اور حسیاتی زندگی سے متعلق ہے دماغی شعور کا علم، نفسی کی جمع ہے"(۲)

اردو لغت میں نفسیات کے معنی اس طرح درج ہیں:

"نفسیات [س] (اردو مذکر) علم النفس، وہ علم ہے جس کا تعلق ذہن سے ہے۔"(۳)

اس مقالے میں "بہاؤ" کے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ سیگمنڈ فرائیڈ کے پیش کردہ نفسیاتی نظریات جن میں تحلیل نفسی، جبلت مرگ، جبلت حیات، نرگسی ثقافت، نظریہ خواب کی روشنی میں کرداروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نذیر احمد سے لے کر موجودہ دور تک بہت سے ناول اپنے کرداروں کی نفسیات کے حوالے سے اہم ہیں۔ انہی میں مستنصر حسین تارڑ کا مشہور زمانہ ناول "بہاؤ" بھی شامل ہے۔ "بہاؤ" کے کردار قدرتی عوامل کے زیر اثر اپنی مٹتی ہوئی تہذیب کے تحفظ کے لیے ذہنی اضطراب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

پاروشنی ناول کا بنیادی کردار ہے اس کردار کی ظاہری شباہت حرکات و سکنات مثلاً گندم کوٹتے ہوئے ہاؤ۔۔۔ دھم۔۔۔۔۔ہاؤ ۔۔۔ دھم کی آواز یا چوڑیوں کے کھنک جیسی باریکیوں کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ پاروشنی کی شخصیت کے مختلف پہلو اس عمدگی سے پیش کیے گئے ہیں کہ کردار حقیقت کا روپ دھار کر قاری کو ناول کے صفحات پر چلتا پھرتا محسوس ہونے لگتا ہے اس کردار کو منفرد کرنے میں اس کی ظاہری شباہت کو بھی بہت دخل حاصل ہے اس کا قد بت، ہلکا سیاہی مائل رنگ، گھنگریالے اور بھورے بال چوڑی ناک بھوکے جانور کی طرح آگے کو نکلا ہوا جبڑا، موٹے موٹے ہونٹ اور چوڑے کولہے جہاں اسے اردو ناول کی روایتی ہیروئن سے مختلف کرتے ہیں وہیں مستنصر حسین تارڑ کا کرداروں کو منفرد انداز میں پیش کرنے کی تکنیک کا بھی منہ بولتا ثبوت ہے۔ پاروشنی کے کردار کی خاص خوبی خودداری اور خود کفیلی ہے۔ ماں باپ نہ ہونے کے سبب ماتی پاروشنی کی پرورش کرتی ہے لیکن پاروشنی ہوش سنبھالتے ہی الگ گھر بنا کر وہاں اپنا گزر بسر کرنے لگتی ہے اور بستی کے کاموں میں اپنا حصہ شامل کرنے کے غرض سے وہ روز صبح سویرے سب کے گھڑے بھرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتی ہے۔

بچپن کی تنہائی کے باعث پاروشنی کی شخصیت میں خالی پن محسوس ہوتا ہے۔ وہ ورچن اور سمرو دو مردوں سے تعلق قائم ہونے کے باوجود اس تنہائی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی۔ پاروشنی کی یہ کیفیت اس وقت شدت اختیار کر جاتی ہے جب وہ ایک مردہ بچے کو جنم دیتی ہے۔ یہ مرا ہوا بچہ پاروشنی کے لیے ازلی دکھ لے کر پیدا ہوتا ہے وہ تمام عمر اس کے نہ رونے کی اذیت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی ۔ورچن اس اذیت کو ذیل کے الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"اسے اس نے گھاگھرا میں نہیں اپنے اندر ڈبویا تھا۔"(۴)

یہی اذیت پاروشنی میں ناسٹلجیا کو جنم دیتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی رجحان ہے جس کو ماضی کے شدید احساس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پریکٹیکل ڈکشنری میں ناسٹلجیا کے معنی یہ ہیں:

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

"Nostalgia describes a longing for the past after in idealized form. Nostalgia may or may not also know as homesickness."(5)

پارو شنی کی شخصیت میں غور و فکر کا عنصر بھی اسی تنہائی کی دین ہے۔ وہ ناول میں متعدد مقامات پر زندگی کے تسلسل، بستی کے پھیلاؤ کے حوالے سے سوال اٹھاتی ہے۔ خواہشات کے اظہار کے نظریے میں پارو شنی فرائیڈ کی ہم خیال نظر آتی ہے۔ وہ اپنی خواہشات کو کنگن سے تشبیہ دیتے ہوئے ورچن اور سمرو کو بھی ایک کنگن قرار دیتی ہے:

"جتنے کم ہوں گے شور بھی کم ہو گا نہ ہوں گے تو سکھ ہو گا شور نہ ہو گا۔۔۔ پر بندہ کون کون سا کنگن اتارے۔"(۶)

فرائیڈ کے نظریے کے مطابق بھی انسان کی تمام خواہشات کا تسکین پانا ناممکن ہے۔ تمام خواہشات اور خاص طور پر جنسی خواہشات کا بے روک ٹوک اظہار ممکن نہیں۔ خود فریفتگی کی پہلی منزل میں ان خواہشات کو دبانا جن کے نوعیت جنسی ہوتی ہے لازمی اور ضروری امر ہے۔ ناول کے اختتام پر پارو شنی مضبوط اعصاب اور مستقل مزاج عورت کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ بستی کی مکمل ویرانی کے باوجود وہ امید کا دامن نہیں چھوڑتی۔ دراصل پارو شنی کا بستی نہ چھوڑنے اور سخت سے سخت حالات میں بھی بچ جانے کے پیچھے یہ محرک ہو سکتا ہے کہ وہ ان حالات کے لیے باقی افراد کی نسبت ذہنی طور پر بہت پہلے سے تیار تھی۔ بستی میں سب سے پہلے اسے بڑے پانی نہ آنے کا علم ہوتا ہے۔ بستی کے باقی لوگوں کی طرح دریا کو خوش کرنے کیلئے وہ اس میں کوئی چیز ڈال کر خود کو دھوکہ نہیں دیتی، ساری صورتحال کو دانشمندی سے دیکھتے ہوئے بہت پہلے ہی مشکل سے مشکل حالات میں بھی کبھی بستی نہ چھوڑنے کا عہد کر لیتی اور اختتام تک اس پر قائم رہتی ہے۔

"بہاؤ" کے تمام نسوانی کردار مادر سری معاشرے کی خوداعتماد اور خودانحصار عورت کی نفسیات کے عکاس ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار پارو شنی اپنی زمین سے شدید محبت کرنے اور کائنات کے بارے میں غور و فکر کرنے والے درویش کی صورت سامنے آتی ہے، پکلی اپنی تہذیب کی شناخت اور فنکار کے طور پر پیش کی گئی ہے، ناول کا ایک اور نسوانی کردار گاگری ہے جو بستی کے مردوں کے مقابلے میں بڑی جرات اور بہادری سے خطرناک جانوروں کا شکار کرتی نظر آتی ہے۔ اسی طرح بستی کی سب عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔

ناول میں کنک (گندم) کے سٹے کے کچے دانے کی باس کو ایسی عورت کے بدن کی باس سے تشبیہ دی گئی ہے جس کی کوکھ کسی بیج کی نشو نما کر رہی ہو۔ ناول نگار عورت اور زمین دونوں کی نسل بڑھانے کے حوالے سے مشترک خصوصیات بیان کر کے پانچ ہزار سال پہلے کی عورت کی اہمیت اور تکریم ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ ناول کے مرد کرداروں کے مکالموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کے لیے یہ اہمیت اور عزت ان کی سوچ کا حصہ ہے۔

"بستی کے سارے کھیت سانجھے تھے اور چھپر اپنے اپنے تھے جو عورت ذات کے ہوتے تھے۔"(۷)

ناول میں مادر سری معاشرے کے پیش نظر ایک عورت کا دو مردوں سے تعلق بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اسی کی ایک جھلک ہمیں پارو شنی کے کردار میں نظر آتی ہے۔ وہ سمرو اور ورچن دونوں کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہے۔ یہاں یہ بات حیران کن ہے کہ جہاں پارو شنی دونوں کو دل سے قبول کر لیتی ہے وہاں ناول نگار سمرو اور ورچن میں کسی قسم کی رقابت کا جذبہ نہیں دکھاتا اور نہ ہی پارو شنی کے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

مردہ بچے کو دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ منسوب کرتا ہے بلکہ اس نے بچے کے نین نقش تک ظاہر نہیں ہونے دیے وہ ان تینوں کرداروں کے ساتھ ساتھ قاری کے تجسس کو برقرار رکھتے ہوئے گھاگرا میں پھینک دیتا ہے اور اس کی شناخت کو مخفی ہی رکھتا ہے۔ ہر عہد، بستی، معاشرہ اپنی جداگانہ روایات تہذیب و تمدن اور ثقافت رکھتا ہے۔ ثقافت متحرک ہوتی ہے، وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ یہی تہذیب و تمدن باقیات کی صورت کسی عہد کو زندہ رکھتی ہیں۔ آج شالامار باغ لاہور، مکلی کا قبرستان، جہلم کے قلعہ روہتاس جیسے مقامات کی اہمیت اسی وجہ سے ہے کیونکہ یہ گزری بستیوں کا پتا دیتے ہیں۔ اسی تہذیبی اور ثقافتی میراث کا گہرا شعور ہمیں پکلی کے کردار میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ پکلی ایک ظروف ساز کا کردار ہے۔ گھڑوں پر بنے بیل بوٹوں کی صورت میں اپنی آخری نشانی، اپنا فن گھاگھرا کے سپرد کر کے مرتے ہوئے اس کے چہرے کا اطمینان قابل دید منظر پیش کرتا ہے کیونکہ اسے اس بات کا یقین ہے کہ اس کے فن کے ذریعے اسے اس طرح یاد کیا جاتا رہے گا جس طرح کھیت میں کام کرتے ہوئے ورچن کو ملنے والی ٹھیکریاں اِس کے بنانے والے کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ ٹھیکریاں بتاتی ہیں کہ وقت کے بے انت سمندر میں زمانے کی لہروں کے اتھل پتھل نے سب کچھ ختم کر ڈالا اور اب محض یہ کچھ نشانیاں بچی ہیں جو گزشتہ بستیوں کا پتہ دیتی ہیں زمانے گزرنے کے ساتھ ساتھ بستیاں ختم ہو جاتی ہیں مگر ان کی جگہ نئی بستیاں، نئے کردار لے لیتے ہیں۔ گاگری ناول کا بہت اہم نسوانی کردار ہے یہ اپنے پھرتیلے اور چھریرے بدن کے باعث ساری بستی کے لیے شکار کا انتظام کرتی ہے۔ ناول نگار نے اس کے شکار کرنے کی تکنیکوں کی بڑی جاندار منظر کشی کی ہے۔ گاگری کا دو سالہ بچہ سر پر چوٹ لگنے کے سبب موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پاروشنی اور گاگری کے کرداروں میں ایسی عورتوں کی نفسیاتی الجھنیں ملتی ہیں جن کے لیے اولاد کی موت اپنے وجود کے موت کا باعث بن جاتی ہے اور اولاد کی جدائی ان کی شخصیت میں ایسا خلا پیدا کر دیتی ہے کہ ساری زندگی بھی اس کی تکمیل کے لیے کم پڑ جاتی ہے۔ بھوکڑ کو مارتے ہوئے اچانک گاگری کے دل میں اسے زندہ چھوڑ دینے کی خواہش جنم لیتی ہے تحلیل نفسی کے ذریعے پتا چلتا ہے کہ بھوکڑ کے سر پر مارتے ہوئے گاگری کی جارحانہ کیفیت پر مادرانہ شفقت غالب آ جاتی ہے اور اسے زندگی کے لیے بھاگتی بھوکڑ میں اپنا مرا ہوا بچہ نظر آنے لگتا ہے۔

فرائیڈ کے جبلت مرگ کے تحت فرد طبعی موت سے پہلے ذہنی اور شعوری طور پر موت کو قبول کر چکا ہوتا ہے گاگری بھی اپنے بچے کی موت کے سبب اپنی طبعی موت سے پہلے ذہنی و نفسیاتی طور پر زندہ لاش نظر آتی ہے جو کہ محض سانس کی آمد و رفت کے لیے زندگی سے نباہ کرنے پر مجبور ہو۔

سمرو ایک کسان ہے۔ گھاگھرا کنارے آباد بستی کی تہذیب و تمدن کی شناخت کا بڑا ذریعہ برتنوں کی ٹوٹی پھوٹی ٹھیکریاں اور پتھروں اور سیپیوں کے بنے منکے، مورتیاں ہیں۔ آج بھی مہنجو داڑوں میں ملنے والی باقیات اس معدوم شدہ تہذیب کی گواہ ہے جس طرح پکلی گھڑے اور صحنک بنا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہے اسی طرح سمرو چھوٹے چھوٹے پتھروں کی مدد سے مختلف منکے اور مورتیاں بناتا ہے جو کہ بستی کے لوگ فصل کی کٹائی پر خوشی کا اظہار کرنے کے لیے بازوؤں پر باندھتے ہیں۔ ہر فنکار کی طرح سمرو اپنے فن کو امر کرنے کی غرض سے منکوں پر اپنا نام کندہ کرتا ہے۔ ایک رات جھجر میں پانی کی کمی سمرو کو پانی ختم ہونے کا خوف دلاتی ہے۔ اسی بارے میں سوچتے ہوئے اسے نیند آن لپکتی ہے اور وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ پانی ختم ہو چکا ہے۔ زمین بنجر ہو چکی ہے اور وہ پانی کے لیے ہانپ رہا ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

فرائیڈ نے خوابوں کو انسانی لاشعور کے تہ خانے میں پڑے خیالات، ناآسودہ خواہشات، خوف اور تجربات کی روپ بدل کر ظاہر ہونے کی کوشش قرار دیا ہے۔ سمرو کے لاشعور میں موجود قحط سالی کا اندیشہ جس سے اس کا شعور بھی ناآشنا ہے خواب میں بھیانک صورت اختیار کر لیتا ہے اور وہ شعوری حالت میں اپنے خواب کی تعبیر سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ اسی طرح قحط سالی کے خوف کے ساتھ ساتھ سمرو کے لاشعور میں پاروشنی سے جنسی اختلاط کی خواہش کا اظہار ذیل کے خواب میں دیکھا جاسکتا ہے:

"جیسے ایک سفید سانپ جنگل کے جانور پر حملہ کرتا ہے ایسے اس کے دانت سفید کونپلوں کی طرح لشکتے ہیں اور اس کی کہنیوں میں چوڑیاں ہیں اور کنگن ہیں اس نے مجھ پر وار کیا ہے۔"(۸)

سمرو اور ورچن دونوں کو برابر سمجھنے کے باوجود پاروشنی کا غیر شعوری طور پر سمرو کی جانب سے جھکاؤ زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

"اور اس کے اندر پھر سمرو کا خیال آیا۔۔۔ نہیں ورچن سمرو سے آگے نہیں تھا۔۔۔ وہ تو پردیس ہوا تب یوں لگا کہ آگے ہے پر ہے نہیں۔"(۹)

شادی کی رات پاروشنی کا ورچن کو چھوڑ کر سمرو کے پاس چلے جانا دراصل اس کے لاشعور میں اڈ (ld) کی سرکش کا نتیجہ ہے۔ جس کے سبب وہ ورچن کو نظر انداز کر کے سمرو کے پاس جانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ناول کے اختتام پر بھی پاروشنی اور سمرو کا ملاپ وقتی طور پر سہی موجودہ حالات کی تلخی کو فرحت بخش بنانے کی ایک غیر شعوری کوشش کہی جاسکتی ہے جسے فرائیڈ نے تبدل (replacement) کا نام دیا ہے فرائیڈ کی یہ اصطلاح ان کی ذہنی حالت پر صادر آتی ہے۔ پانی کی تشنگی کو وہ جنسی تشنگی کی صورت پورا کرتے ہیں۔

ڈور گا بھٹے میں کام کرنے والے سخت جان انسانوں کا نمائندہ ہے۔ جو ساری زندگی جانوروں کی طرح گزار دیتے ہیں۔ ان کی پیدائش بھٹے کی اونچی دیواروں کے اندر ہوتی ہے اور موت بھی یہیں ہوتی ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ روح کی قید سے آزاد ہونے کے بعد بھی ان کے جسموں کو اس قید خانے سے باہر کی مٹی نصیب نہیں ہوتی۔ انہیں اسی چار دیواری کے اندر کہیں دفنا دیا جاتا ہے۔ نسل در نسل غلامی اور بھوک برداشت کرتے ہوئے یہ انسان زندگی کے حقیقی معنوں سے ناآشنا ہو جاتے ہیں اور محض دو وقت کی روٹی کے عوض اپنی نسلوں تک کی زندگی وڈیروں کے نام کر دیتے ہیں۔ بھٹے میں ان کے شب و روز تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ برس ہا برس گارا بنانے، اینٹیں پکانے اور انھیں ڈھونے میں ہی گزار دیتے ہیں۔ بھٹے کے سخت جان کام کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ناول نگار نے اسے رت کو نچوڑ کر اس کی سرخی کو کالک میں بدلنے والا کام قرار دیا ہے۔ جب ناول نگار کہتا ہے کہ "پچھلے ہزار برس میں وہ پہلا تھا جو باہر آیا۔"(۱۰)

تو ڈور گا اور ان ہزار برسوں میں بھٹے کے اندر پیدا ہو کر مرنے والوں کا دکھ قاری اپنے دل میں محسوس کر سکتا ہے۔ ڈور گا کے دل کی حسرتیں اس وقت جاگتی ہیں جب وہ بھٹے کی چار دیواری سے باہر آتا ہے اور زندگی کو ہنستے کھیلتے دیکھتا ہے۔ اس سے قبل تو اسے اپنی خواہش، اپنی مرضی کے بارے میں سوچنے تک کی اجازت نہ تھی۔ وہ محض جانوروں کی طرح جھکا ہوا اینٹیں ڈھوتا رہتا۔ مونجھ میں اپنے ہاتھ سے بنائے گئے کھلونوں سے نہ کھیلنے کے حسرت کا اظہار وہ اس طرح کرتا ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

"موہنجوں کے بچے مٹی کی جن بیل گاڑیوں کلہریوں اور اندھے بندروں کے ساتھ کھیلتے تھے ان کو بھٹے کی آگ میں، میں پکاتا تھا۔۔۔ میں بھی بچہ تھا اس سے پر میرا کام ان کھلونوں کو پکانا اور ان کا کھیلنا۔۔۔ میں کاماتھا وہ کھیلنے والے۔"(۱۱)

ڈور گا اتنا عرصہ بھٹے میں جانوروں کی طرح کام کرتے کرتے اس کام (مٹی) میں اتنا رچ بس جاتا ہے کہ اس اذیت ناک زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے باوجود وہ مٹی سے نفرت نہیں کر سکتا بلکہ مٹی کی دوری اسے بے چین کرتی ہے۔ اسی عادت سے مجبور ہو کر وہ پکلی کے آوے سے اپنا الگ آوا بناتا ہے اور اس میں اینٹیں بناتا ہے۔ بظاہر ڈور گا کا اینٹیں بنانا بھٹے پر کام کرتے مزدوروں جیسا ہی عمل ہے لیکن دونوں صورتوں میں انسان کی ذہنی کیفیت بالکل مختلف ہے بھٹے پر جبر کے زیر اثر کیے جانے والے عمل کو ڈور گا جب اپنی رضامندی سے کرتا ہے تو اس کے روئیں روئیں سے خوشی اور سرشاری پھوٹتی ہے یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کے زیر اثر کوئی کام جبر یا مشقلے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ڈور گا کی اینٹ سے بنا گھر دیکھنے اور اس گھر میں جانے کی خواہش صرف اس کی نہیں بلکہ ان تمام نسلوں کی خواہش ہے جنہوں نے بھٹے میں انٹیں ڈھوئیں او ر اس بات سے انجان رہے کہ باہر کی دنیا میں ان اینٹوں سے کیا بنتا ہے۔ ڈور گا اور ہزار برس سے بھٹے میں کام کرنے والے مظلومیت کی علامت ہیں یہی مظلومیت اسے حساس انسان بنا دیتی ہے۔ ہری یوپیہ کے باہر کنک پیسنے والے واہیکوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈور گا کے لہجے میں ان کے لیے ہمدردی محسوس کی جا سکتی ہے۔ دراصل ان کے کام کے بوجھ سے جھکی کمر اور چکیوں پر بیٹھے بیٹھے جڑی معذور ٹانگوں میں ڈور گا کو اپنا عکس نظر آتا ہے۔ کیونکہ انسانی ذہن اس دکھ درد کا زیادہ اثر لیتا ہے جو وہ خود برداشت کر چکا ہو۔

ناول میں ایک کردار بھینسے کا بھی ہے۔ جو کہ ظلم اور طاقت کی علامت ہے جبکہ ڈور گا اور ہزار برس سے بھٹے میں کام کرنے والے مظلومیت کی علامت ہیں۔ بھینسے کے طاقتور ہونے اور دوسروں پر بے رحمی کرنے کا عمل ڈور گا کو بھٹے کے مالکان کی یاد دلاتا ہے بھینسے اور بھٹے کے مالکان میں اس قدر مماثلت ڈور گا میں جذبہ انتقام کو جنم دیتی ہے اور وہ ہیجانی کیفیت کے زیر اثر خود سے کئی گنا طاقتور بھینسے کو ختم کر دیتا ہے۔ بھینسے کا خاتمہ ڈور گا کے نزدیک دنیا سے ظلم وزیادتی کا خاتمہ ہے۔ ڈور گا کی اس ذہنی حالت پر تبدل (replacement) کا نظریہ صادر آتا ہے کیونکہ وہ استحصال کرنے والوں سے بدلہ نہ لے سکنے کے متبادل کے طور پر بھینسے سے بدلہ لے کر ذہنی اطمینان حاصل کر لیتا ہے۔

ٹیلے پر سے گزرتے ہوئے ورچن جب ڈور گا کو بتاتا ہے کہ اگر ان ٹیلوں پر پانی نہ ڈالا جائے تو یہاں پر پیاس کی شدت سے مرنے والوں کی روحیں تمہیں تمہارے باوا کے نام سے پکارتی ہیں تو اس پر ڈور گا خواہش ظاہر کرتا ہے کہ کاش وہ روحیں مجھے میرے باوا کے نام سے پکاریں کیونکہ وہ اپنے باپ کے نام سے بھی ناآشنا تھا بھٹے کی چار دیواری کے اندر ہزار برس سے انسان بغیر باپ کا نام جانے محض اپنے حصے کا قرض اتارنے کے لیے جنم لیتا اور یہی قرض اتارتے اتارتے اسے موت آن لپکتی لیکن جیسا کہ انسانی فطرت کا حصہ ہے ڈور گا بھی اپنی شناخت، اپنی پہچان جاننے کا متمنی ہے۔ مامن ماسا ایک ایسا کردار ہے جو بستی سے علیحدہ ہو کر جنگل میں چلا جاتا ہے اور پھر وہیں رہتا

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ہے۔اس کردار میں Multiple personality disorder کی علامات ملتی ہیں۔ناول میں متعدد مقامات پر دیکھا گیا ہے کہ وہ خود کو رکھ سمجھتا ہے اور اس بیماری میں مبتلا مریضوں کی طرح اسے مختلف طرح کی آوازیں سنائی دیتی ہیں:

"یہ کون بولا؟" ماسا نے کان کھڑے کر دیے وہ کون بولا؟" "میں اور کون؟" ایک رکھ بولا "میں میں" دوسرا کہنے لگا "اور" "میں" ایک پیپل کے پتے کھڑکے "(۱۲)

مامن ماسا اگرچہ پہلے بھی رکھوں میں رہتا تھا اور عجیب وغریب باتیں کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ بستی کا بھی رخ کر لیا کرتا۔ماتی کے کھیتوں میں بڑے پانی نہ آنے کی خبر مامن ماسا ہی اس تک پہنچاتا ہے مگر اس کی ذہنی حالت میں شدت اس وقت واقع ہوتی ہے جب بستی اجڑ جاتی ہے اور قحط سالی کے سبب سب مر رہے ہوتے ہیں ان حالات سے متاثر ہو کر وہ اپنی ذات کی نفی کر کے خود کو رکھ تصور کرنے لگتا ہے۔بظاہر مامن ماسا خود کو بستی والوں سے الگ تھلگ سمجھتا ہے لیکن اس کے لاشعور میں چھپے کرب پر شعور کے قہقہے اس کی ذہنی حالت کے غماز ہیں۔Multiple personality disorder کے مریض اپنی ذہنی اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے کسی شخصیت یا روپ کو خود پر طاری کر لیتے ہیں۔اسی صورتحال کا شکار یہ کردار مامن ماسا نظر آتا ہے

"رکھ کہیں آتا جاتا نہیں۔۔۔میں رکھ ہوں" ماسا نے کہا۔۔۔چیوا سر جھکاتا اور چلا جاتا اور اسی طرح کئی بار ایسا ہوا کہ وہ اس جگہ آیا جہاں اوپر مامن ماسا تھا اور وہ سوکھی ٹہنیوں میں اتنا گھلا ملا ہوتا کہ بڑی دیر تک اسے پتہ نہ چلتا کہ وہ کہاں ہے اور کس ٹہنی کے ساتھ ہے اور وہ منہ اٹھا کر بولنے لگتا۔ادھر سے جواب آتا تو وہ جانتا کہ وہ جو اوپر دائیں جانب پر ٹہنی ہے تو وہ اصل میں ٹہنی نہیں ماسا ہے۔۔۔۔۔۔کئی بار جواب نہ آتا تو وہ جانتا کہ وہ جو اوپر ٹہنی ہے تو اصل میں بھی ٹہنی ہے۔"(۱۳)

مامن ماسا اگرچہ پہلے بھی رکھوں میں رہتا تھا اور عجیب وغریب باتیں کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ بستی کا بھی رخ کر لیا کرتا۔ماتی کے کھیتوں میں بڑے پانی نہ آنے کی خبر مامن ماسا ہی اس تک پہنچاتا ہے مگر اس کی ذہنی حالت میں شدت اس وقت واقع ہوتی ہے جب بستی اجڑ جاتی ہے اور قحط سالی کے سبب سب مر رہے ہوتے ہیں ان حالات سے متاثر ہو کر وہ اپنی ذات کی نفی کر کے خود کو رکھ تصور کرنے لگتا ہے۔بظاہر مامن ماسا خود کو بستی والوں سے الگ تھلگ سمجھتا ہے لیکن اس کے لاشعور میں چھپے شعور کے قہقہے اس کی ذہنی حالت کے غماز ہیں۔ملٹیپل پرسنلٹی ڈس ارڈر کے مریض اپنی ذہنی اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے کسی شخصیت یا روپ کو خود پر طاری کر لیتے ہیں۔اسی صورتحال کا شکار یہ کردار مامن ماسا نظر آتا ہے۔

چیوا بستی والوں سے الگ تھلگ اپنے چھپر میں پڑا رہتا ہے اور بھیڑ بکریاں چراتا ہے۔بستی میں صرف گاگری کبھی کبھار اس سے ملنے اس کے چھپر میں چلی جایا کرتی تھی۔ گاگری کی موت کے بعد چیوا کی نفسیات پر زیادہ تر یاسیت کا غلبہ رہتا ہے حتی کہ اسے اپنی بھیڑ بکریوں سے بھی کوئی رغبت نہیں رہتی۔ گاگری کی موت اسے شدید ذہنی اضطراب میں مبتلا کر دیتی ہے۔اسی ذہنی کیفیت کے زیر اثر وہ مامن ماسا کے ساتھ رکھوں میں رہنے کا فیصلہ کر لیتا ہے اور پھر وہیں چلا جاتا ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ناول میں ورچن نامی کردار سیاح کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ مہنجو داڑو اور مختلف مقامات پر سیر و سیاحت کے لیے جاتا اور وہاں آریاؤں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ آریاء مختلف علاقوں پر قبضہ کرتے ہوئے اس کی بستی کی جانب آرہے ہیں۔ اسی لیے وہ پورن (جسے آریاؤں کے نمائندے کے طور پر پیش کیا گیا ہے) کی طرف سے دوستی کا بڑھا ہوا ہاتھ نفرت اور حقارت سے جھٹک دیتا ہے۔ دراصل ورچن کی پورن سے بے اعتنائی اور تضحیک کے رویے کے پیچھے اس کے لاشعور میں چھپی احساس کمتری ہے۔

"ہم تو آنا ساہیں تمہارے جن کی ناک نہیں ہے اور اسی لیے ہماری مت بوجھ بھی کم ہے تم سے۔"(۱۴)

یہی احساس کمتری اس کے اندر بغاوت کے جذبے کو جنم دیتی ہے اور وہ پہاڑ پر سے اترنے والے آریاؤں سے اپنی بستی کی حفاظت کا تہیہ کر لیتا ہے۔ پہاڑوں پر سے اترنے والے حکمران قوم کے نمائندے ہیں جو دوسروں کے علاقوں پر قابض ہو کر ان کی بولی میں کچھ ملاوٹ کر کے اپنی نئی زبان گھڑ لیتے ہیں اور ان کی چیزوں کو اپنا نام دے کر اپنا لیتے ہیں۔ خود پرستی میں مبتلا معاشرہ جس کے رہنے والے ہر وقت اسی بارے میں چوکنا رہیں کہ کوئی ان پر سبقت نہ لے جائے اور خود اپنی حدود کو وسیع کرنے کی فکر میں لاحق رہیں ان کے لیے گراس سٹورٹ نے نرگسی ثقافت کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

"ہر وقت چوکنے رہتے ہیں کہ کہیں ان پر کوئی سبقت نہ لے جائے۔ نرگسیوں کا ایک جم غفیر ہے کہ ایک دوسرے کو کہنیاں اور کندھے مارتے، دھکیلتے، سازشیں کرتے اور چھل فریب سے کام لے کر بہتر سے بہتر آئینے کے لیے گریبان گیر نظر آتے ہیں۔"(۱۵)

ورچن اور پورن کے کردار اپنے اپنے معاشرے کی اجتماعی نفسیات پیش کرتے ہیں۔ گھاگھرا کنارے رہنے والوں کے جسے اور روحیں نئی تبدیلیوں کو قبول نہیں کرتے وہ ہمیشہ سے ایک جیسی زندگی گزارتے چلے آئے ہیں اور ہمیشہ ویسی ہی گزارنے کے متمنی ہیں جمود ان کے وجود کا حصہ بن چکا ہے۔ ورچن اور پورن کی بستی کے افراد میں فرق پورن کے اس مکالمے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے:

"تم کہتے ہو کہ گھر کو سورج کی روشنی اور پرائے کی نظر سے بچاؤ اور ہم روشنی میں رہنا چاہتے ہیں اور پرائے کی نظر سے نظر ملاتے ہیں یہ فرق ہے۔"(۱۶)

بستی کے لوگوں کا کوئی ایک مذہب نہ تھا۔ ناول کے ذریعے ان کا سورج کو پوجنا، پانی کو ماں اور زیبو بیلوں کو مقدس قرار دینے کے شواہد ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ویدک جس کا تعلق ہندوازم سے ہے، کا بھی کئی جگہ ذکر ملتا ہے۔ مزید لوگوں کا دریا کو خوش کرنے کے لیے اس میں نذرانے ڈالنا، بے اولاد عورتوں کا اولاد کے لیے درختوں پر دھاگے باندھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی زندگی خوف اور وہموں کے سائے تلے گزری ہے۔ پھر بنجر زمین، کھیتوں میں دھوپ کی تپش سے گلتا سڑتا بیکار ہوتا بیج، بھوک اور پیاس کی شدت سے مرتے انسان اور جانور اس خوف اور دہشت میں شدت کا باعث بنتے ہیں۔ اسی طرح دھروا مذہب کے استعارے کے طور پر لایا گیا ہے جو کہ زیبو بیلوں کی دیکھ بھال کرتا ہے، انھیں مقدس سمجھتا ہے اور ان کی بے حرمتی سے خوفزدہ نظر آتا ہے لیکن زیبو بیلوں کے مرنے پر ڈورگا جب دھروا کو بیل، چیل کوؤں کے حوالے کرنے کی بجائے خود کھانے کا مشورہ دیتا ہے تو دھروا کا منہ پرے کر کے کہنا کہ

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

"میں بھی بہت دن سے بھوکا ہوں"(۱۷)

ظاہر کرتا ہے کہ گویا اب بھی اس کے دل میں بیلوں کا تقدس موجود ہے مگر بھوک اس کے تقدس اور خوف پر غالب آگئی ہے اور اس کے پاس اس غلبے کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ناول کے آغاز میں پیاسے پرندے کی موت انسان کی ناآسودہ خواہشات کی علامت بن جاتی ہے۔ جس کی زندگی آہستہ آہستہ فنا کی طرف بہتی جارہی ہے۔ لیکن وہ اس پرندے کی طرح اڑنے پر مجبور ہے۔ اس پرندے کے سفید دودھیا پروں کا رنگ بھورا ہوتا چلا جاتا ہے اور رگوں میں تیرتی نمی سوکھ جاتی ہے۔ آنکھیں بند ہونے سے زرا پہلے اسے پانی نظر آتا ہے لیکن پانی تک رسائی سے پہلے ہی دم توڑ دیتا ہے۔ اس کی تشنگی انسانی مقدر کی نارسائی کی علامت بن جاتی ہے۔ رکھوں میں مور اس وقت سے موجود تھا جب سے بستی موجود تھی۔ اس مور کی مدہم ہوتی آواز کو بستی کی تہذیب کے انہدام کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ناول کے اختتام تک بستی کے ساتھ مور بھی آخری سانسیں لیتا دکھایا گیا ہے۔

سیدھی پٹڑی پر چلتی ریل کو جب کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو کہانی جنم لیتی ہے۔ گھاگھرا کنارے آباد بستی کی زندگی ایک ڈگر پر چل رہی تھی۔ وہ زمین کھودتے، بیج بوتے، بڑے پانی آتے، فصل کاٹتے اور سمرو کے بنائے ہوئے مٹکے مہرے بازوؤں پر باندھتے لیکن اس رواں دواں زندگی میں جب بڑے پانی آنا بند ہو جاتے ہیں۔ سرسبز زمین ریت اور بنجر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہر سال کنک سے بھر جانے والے مٹکے ایک سال کے لیے خالی ہو جاتے ہیں تو اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔

کسی علاقے یا قصبے کی معشت کا اثر لوگوں کے رویوں، بول چال پر بھی پڑتا ہے۔ گھاگھرا کنارے آباد بستی میں جب خوشحالی تھی ۔بڑے پانی چنگاڑتے آتے تو لوگ زندہ دل تھے۔ آپس میں ہنستے بولتے تھے۔ لیکن جب بڑے پانی نہیں آتے اور زمین بنجر ہو جاتی ہے تو وہ گویا گونگے ہو گئے۔ کرداروں کا ذہن آنے والے خدشات کے خوف سے الجھا ہوا نظر آتا ہے پھر یہ خوف مایوسی میں بدل جاتا ہے اور مایوسی اور ناامیدی کا یہ سایہ ساری بستی پر اپنی کالک ملتا محسوس ہوتا ہے۔ دراصل خشک سالی سے قبل بستی کے لوگوں کی ساری حیاتی بیج کے گرد گھومتی تھی۔ مثلاً زمین بونا، بیج ڈالنا، بڑے پانی کے آنے کا انتظار کرنا، فصل کاٹنا اور اب جب بیج ہی نہ تھا تو ان کے پاس بات کرنے کو کوئی موضوع نہ بچا۔

فرائیڈ کے نظریہ جبلت حیات کے تحت ناول کے کردار اپنی بقا کے لیے مختلف حربے اپناتے ہیں بڑے پانی نہ آنے کی صورت میں کبھی دریا سے پانی لے جا کر کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں تو کبھی فصل نہ ہونے پر بیج کے سڑنے کے ڈر سے مٹی سے بیج ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے ہیں۔ کبھی انہیں اپنی ثقافت کے تحفظ کی فکر لاحق ہوتی ہے تو کبھی اپنی زمین چھوڑنے کے خدشات۔

ناول کے اختتام پر بستی میں چھایا سناٹا قاری اپنے اندر محسوس کر سکتا ہے۔ کسی ناول کا قاری پر اس قدر اثر انداز ہونا ہی اس کے شاہکار ہونے کی دلیل ہے۔ اختتام پر بستی کا زوال دیکھ کر ن۔م۔راشد کی نظم "حسن کوزہ گر" کے ذیل کے مصرع ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔

جہاں زاد نو سال کا دور یوں مجھ پہ گزرا
کہ جیسے کسی شہر مدفون پر وقت گزرے(۱۸)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

مختصر اس آرٹیکل میں فرائیڈ کے نظریات کی روشنی میں کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کی نفسیاتی تشکیل میں اس کا ماحول بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ ناول کے بنیادی کرداروں میں اپنی تہذیب کی ختم ہونے کے سبب ذہنی تناؤ اور جبلت حیات کا عنصر غالب ہے۔ زمانے میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں لیکن ہر طرح کے حالات و حادثات کے باوجود انسان بچ نکلتا ہے ۔ناول میں ڈور گا کی صورت میں نسل در نسل غلامی کرنے والے انسانوں کی خواہشات اور حسرتوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ پانچ ہزار سال قبل مادر سری معاشرے کی خود مختار عورت کی نفسیات پیش کی گئی ہے

حواشی و حوالہ جات

۱۔ مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۲۰، ص ۳

۲۔ خویشگی، محمد عبد اللہ خان، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۷، ص ۶۶۰

۳۔ مقبول بیگ بدخشانی، مرزا، اردو لغت، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۳، ص ۲۴۸

۴۔ مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۲۰، ص ۱۷۲

۵۔ Advanced Practical dictionary (English to English to Urdu) with brief general knowledge, Azhar publisher, Laore,1988,P.856

۶۔۔ مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۲۰، ص ۳۷

۷۔ ایضاً، ص ۳۲

۸۔ ایضاً، ص ۳۱

۹۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۷۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۳۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۷

۱۵۔ Stewart Grace, Narcissus, London ,George & Allen unwin , 1956, P.93

۱۶۔ مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، ص ۶۴

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۲۶

۱۸۔ ن م راشد، لا انسان، المثال گاڑی ٹرسٹ بلڈنگ، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۳۸

References in Roman Script:

1. Mustansar Hussain Tarrar, Bahao,Lahore:Sang-e-meel publications, 2020,P. 3
2. Hawashgi, Muhammad Abdullah khan , farhang amra, lslamabad : mukrtadra komi zuban, taba doum , 2007, P. 660
3. Maqbool baig badkhashani, mirza, Urdu lughat Lahore: markazi urdu board, 1963, P. 248
4. Mustansar Hussain Tarrar, Bahao,Lahore:Sang-e-meel publications, 2020, P. 172
5. Advanced Practical dictionary (English to English to Urdu) with brief general knowledge, Azhar publisher, Laore,1988, P. 856
6. Mustansar Hussain Tarrar, Bahao,Lahore:Sang-e-meel publications, 2020, P.37
7. Ibid, P. 32
8. Ibid, P. 31
9. Ibid, P. 116
10. Ibid, P. 176
11. Ibid, P. 124
12. Mustansar Hussain Tarrar, Bahao,Lahore:Sang-e-meel publications, 2020, P. 127
13. Ibid, P. 234
14. Ibid, P. 57
15. Stewart Grace,"Narcissus", London ,George & Allen unwin , 1956, P. 93
16. Mustansar Hussain Tarrar, Bahao,Lahore:Sang-e-meel publications, 2020, P. 64
17. Ibid, P. 226
18. Noon meem Rashid, la Insan, Lahore:Al missal gari trast building, near road, 1969, P. 38

Ms. Almas Akmal received her M.A. degree in Urdu and is currently serving as a lecturer at M.A. Jinnah College, Jhelum, Pakistan. Her current research interest focuses Urdu research and editing.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 25th Feb, 2024 | Accepted: 11th June, 2024 | Available Online: 30th June, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i01.389

پی ایچ ڈی کی سطح پر پاکستانی جامعات میں آپ بیتی پر محررہ مقالات کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ

A Critical and Research Review of Written Thesis on Autobiography at PhD Level in Pakistani Universities

DR. REHMAN SARWAR BAJWA
Lecturer Urdu, Islamia University, Bahawalpur, Pakistan
(rahmansbajwa@hotmail.com)

ABSTRACT In universities, research on Autobiography has not only clarified the general requirements of this genre but also made it much easier to determine the boundaries and restrictions of this sort. Initial research in universities was limited to the intellectual and technical examination of Autobiographies. A reader takes interest in the genre of Autobiography not only because of his attachment to the personality of Autobiography, but also because of the political, social, cultural and cultural elements of the era of Autobiography. The Article examines the Thesis, written in Pakistani universities on Urdu Autobiography at the PhD level so that the techniques and tradition of Autobiography can be further improved.

Keywords Pakistani Writers, Urdu Literature, Selective Autobiographies, Memoirs, Pakistani Universities, Research Thesis, PhD Urdu, Political, historical and Cultural awareness.

پاکستانی جامعات میں مجموعی طور پر اردو زبان و ادب پر تحقیق کا کام حوصلہ افزا ہے اور اس تحقیق کی بدولت اردو سرمایے میں گراں مایہ اضافہ ہوا ہے، لیکن بنیادی بات یہ کہ تحقیق کے مسائل پر توجہ دینے کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ ہماری جامعات میں ہونے والی تحقیق کی خوبیوں اور خامیوں کا بہتر طور سے اندازہ نہیں لگایا جاتا اور نہ ہی تحقیق میں نئی جہتوں کی تلاش کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ ہمارے محقق ایک روایتی ڈگر پر ہی چلتے نظر آتے ہیں۔ مختلف جامعات میں جو تحقیقی کام ہو رہا ہے، اس سے دیگر جامعات کے اساتذہ و طلبہ کو باخبر ہونا چاہیے۔ اسی طرح جامعات میں تحقیقی موضوعات میں پائی جانے والی تکرار سے بچا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی جامعات میں پی ایچ ڈی کی سطح پر، آپ بیتی کی صنف پر اب تک جتنے مقالات لکھے گئے ہیں ان میں سے چند مقالات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ ذیل میں لیا گیا ہے۔

محمد صفدر رانا نے ڈاکٹر روبینہ ترین کی نگرانی میں ۲۰۰۳ء میں بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے، "اردو شعراء و ادباء کی خود نوشتیں ۱۹۹۰ء تک۔ تحقیق و تنقید کی روشنی میں" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ محمد صفدر اس سے پہلے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کی سطح پر ڈاکٹر طاہر تونسوی کی نگرانی میں "اردو آپ بیتی کی تاریخ آغاز سے ۱۹۴۷ء تک" کے عنوان سے مقالہ لکھ

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

چکے تھے۔ محمد صفدر رانا نے اپنے پی ایچ ڈی مقالے کے پہلے باب میں آپ بیتی کے فنی مباحث کو بیان کیا ہے۔ مقالہ نگار کے نزدیک آپ بیتی محض شخصیت کے اظہار کا نام نہیں بلکہ اس میں سماج کی شراکت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ محقق نے تاریخ، سوانح اور خود نوشت کے مابین امتیازات پر پہلے باب میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اپنی ذات کے حوالے سے سچ لکھنے کے نفسیاتی اور سماجی تقاضوں پر قلم اٹھاتے ہوئے لکھا ہے:

> "کسی شخص کی سچی، غیر جانب دار، بے لاگ اور ظاہر و باطن کی مکمل تصویر اس صورت میں پیش کی جا سکتی ہے جب اس کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ افعال کو بلا امتیاز معرض تحریر میں لایا جائے۔ مغرب میں مذہب کو فرد کا انفرادی معاملہ قرار دیتے ہوئے شاید یہ بات ممکن ہو لیکن ہمارے ہاں مسلمانوں میں اس تصور کو قبول نہیں کیا گیا بلکہ ذات کے بارے میں بعض انکشافات سماجی، اخلاقی اور مذہبی نقطہ نظر سے قابل اعتراض گردانے جاتے ہیں اور یہی وہ بنیادی وجوہات ہیں جو بعض اوقات شخصیت کے بعض کمزور پہلوؤں کو چھپانے پر مجبور کرتی ہیں۔"(۱)

محمد صفدر رانا نے پہلے باب میں خود نوشت کی تاریخی، تہذیبی، اخلاقی، نفسیاتی و ادبی اہمیت پر بھی تحریر کیا ہے اور آپ بیتی کی ابتدائی صورتیں جیسے خطوط، روزنامچے، سفر نامے، سرگزشتیں، روپورتاژ، انٹرویو اور مثنویوں کے ان عناصر کی نشاندہی کی ہے جو خود نوشت کی صنف اور فن میں مماثلت رکھتے ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ ہر صنف تکنیک کے اعتبار سے دوسری اصناف سے مختلف ہے۔ محمد صفدر رانا نے اپنی تحقیق کے دوسرے باب میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں آپ بیتی کے نقوش کو مختلف اصناف کے حوالے سے دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ تیسرے باب میں تقسیم سے قبل اردو شعراء اور ادباء کی خود نوشتوں کا تہذیبی و معاشرتی تناظر میں جائزہ لیا ہے۔ ان خود نوشتوں میں ابوالکلام آزاد، عبدالغفور نساخ، حسرت موہانی، ظہیر دہلوی، حکیم احمد شجاع، خواجہ حسن نظامی، افضل حق اور شوکت تھانوی کی خود نوشتیں شامل ہیں۔ چوتھے باب میں صفدر رانا نے ۱۹۴۷ء سے نوے کی دہائی تک خود نوشتوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان خود نوشتوں کی تعداد دو درجن کے قریب ہے جن میں سے سات خود نوشتوں کے مصنفین کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ آخری باب میں محقق نے اپنے مقالے کی تلخیص بیان کی ہے اور خود نوشت کے فن کو مزید بہتر بنانے کے لئے سفارشات مرتب کی ہیں۔ محقق کا کہنا ہے کہ خود نوشت کے مصنف کو احساس تفاخر سے بچنا چاہیے اور خود نوشت میں من گھڑت اور محیر العقول واقعات کو بیان کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ محقق کے لیے یہ بات باعث اطمینان ہے کہ فی الوقت خود نوشت کی صنف میں ماضی کے مقابلے میں زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے۔ موجودہ دور میں جو خود نوشتیں لکھی جا رہی ہے ان کے پڑھنے سے نا صرف مصنفین کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے بلکہ ان کے ادوار سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ صفدر رانا کے بقول خود نوشت ادبیت سے عاری نہیں ہونی چاہیے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

> "سوائے احسان دانش اور وزیر آغا کے دیگر خود نوشت نگاروں نے تحلیل باطن کے فقدان اور معروضی واقعات زندگی اور مصنوعی تاثرات و تصورات کے درمیان جمالیاتی فاصلے کو قائم نہ رکھ سکنے کی کمزوری کو تاریخی عناصر یا افسانوی اسالیب کے پردے میں چھپانے کی کاوش کی ہے۔"(۲)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

صفدر رانا کی تحقیق کا موضوع ۱۹۹۰ء تک کی طبع زاد خود نوشتوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ تھا۔ لیکن انہوں نے آخری باب میں ان خود نوشتوں کا بھی مختصر احوال بیان کیا ہے جو ۱۹۹۰ء کے بعد شائع ہوئیں۔

پی ایچ ڈی کی سطح پر دوسرا اہم کام سلمان علی کا آتا ہے۔ جنہوں نے ۲۰۰۶ء قرطبہ یونیورسٹی جامعہ پشاور سے ڈاکٹر صابر کلوروی کی نگرانی میں "اردو کی منتخب خود نوشت سوانح عمریوں کا مطالعہ (خرق عادات واقعات کے خصوصی حوالے سے)" کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں محقق نے خرق عادات واقعات کی ماہیت و نوعیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انسانی زندگی میں ہونے والے معجزات خرق عادات واقعات میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ معجزات بغیر ظاہری اسباب کے وجود میں آتے ہیں لیکن ان کا وجود میں آنا، تحقیق کے در کھولنے میں اہم سبب بنتا ہے۔ علم نفسیات بھی اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ سلمان علی آپ بیتی کی صنف کے متعلق لکھتے ہیں:

> "تخلیقی اعتبار سے آپ بیتی کا عنصر تمام اصناف ادب میں موجود ہے۔ جن میں شاعری، افسانوی و غیر افسانوی ادب شامل ہیں۔ اس کے باوجود افسانوی و غیر افسانوی ادب نیز شاعری میں اگر مصنف کی ذات جلوہ گر ہو تو بھی اسے فنی و تکنیکی اعتبار سے خود نوشت سوانح عمری نہیں کہا جائے گا تاہم انہیں آپ بیتی کی مختلف شکلیں قرار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"(۳)

سلمان علی کے نزدیک معین الدین عقیل کی تحقیق کی روشنی میں اولین نسوانی خود نوشت شہر بانو بیگم کی "بیتی کہانی" ہے اور ابتدائی مردانہ خود نوشت ڈاکٹر سلیم مروت کی تحقیق کی روشنی میں "سیتارام" ہے۔

> "ڈاکٹر صاحب (طارق سلیم مروت) کی تحقیق اگرچہ قیاس پر مبنی ہے مگر ہے ٹھوس بنیادوں پر استوار۔ دوسری بات یہ کہ انھوں نے ایک اچھے محقق کی طرح دعویٰ نہیں کیا ہے جس سے ان کے قیاس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کے نتائج اور حقائق کی اہمیت سے فی الوقت انکار کی گنجائش ممکن نہیں۔"(۴)

فنی اعتبار سے خود نوشت کا جائزہ لیتے ہوئے محقق نے ڈاکٹر وہاج الدین علوی کی خود نوشت سے متعلق سفارشات کو اپنی تحقیق میں حوالہ بنایا ہے۔ سلمان علی نے ڈاکٹر سید عبداللہ کی آپ بیتی سے متعلق اس رائے کو کہ "سوانح عمری لکھ کر بھی ضروری نہیں کہ کوئی شخص آپ بیتی لکھ سکے۔"(۵) کا نفسیاتی طور پر تجزیہ کیا ہے اور سید عبداللہ کی اس رائے کو حق بجانب ٹھہرایا ہے۔ محقق نے دوسرے باب میں اولیاء، فقرا اور مزارات کے حوالے سے مافوق الفطرت کرداروں اور واقعات کی نشاندہی کی ہے۔ مصنف کے بقول ان واقعات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ان واقعات سے نہ صرف مصنف کی ذات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ ان واقعات سے مخصوص دور کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔ محقق نے ان واقعات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ اولیاء و فقرا کی کرامات کا تعلق روحانیت اور معرفت خداوندی سے نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک فنی چیز ہے اور مخصوص ریاضتوں اور کوششوں سے ہر شخص بلا تمیز مذہب و ملت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ فن خیال کے ارتکاز سے متعلق ہے اور اسی فن سے ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم جیسے علوم کی راہ ہموار ہوئی ہے۔ ہماری خود نوشتوں نے زیب

داستان کے لئے بھی ان خرق عادات واقعات کو بیان کر دیا ہے تا کہ قاری کی توجہ حاصل کی جا سکے۔ محقق لکھتا ہے:

" انسان کی لالچ، ہوس پرستی اور خواہشات نے در حقیقت ضعیف الاعتقادی کے وجود کو پنپنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔"(۶)

تیسرے باب میں خود نوشتوں میں بیان ہونے والے پر اسرار خوابوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کے بارے میں دعوی کیا جاتا ہے کہ یہ خواب سچے ثابت ہوئے ہیں۔ محقق نے ان خوابوں کا دینی اور نفسیاتی حوالے سے جائزہ لیا ہے اور خوابوں کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ محقق کے نزدیک زیادہ تر خود نوشت نگاروں نے خواب کے حوالے سے محض افراط و تفریط کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن ان کے خوابوں سے انسانی لاشعور تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور انسانی شخصیت میں چھپے ہوئے گوشے نمایاں ہوتے ہیں چوتھے باب میں محقق نے مختلف خود نوشتوں میں محیر العقول واقعات و روایات کو بیان کرنے کے بعد ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ مذہبی اور نفسیاتی حوالے سے لیا ہے۔ ان محیر العقول واقعات کے پیچھے بھی ضعیف الاعتقادی کو قرار دیا ہے۔ اور اس مسئلے کا قرآن پاک کی ان آیات کے حوالے سے حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جن میں انسانوں کو غور و فکر اور تدبر سے کام لینے کا درس دیا گیا ہے۔ محقق نے اسی طرح پانچویں باب میں خود نوشتوں میں بیان ہونے والی سنسنی خیز پیشین گوئیوں، چھٹے باب میں مافوق الفطرت کرداروں جیسے ارواح اور جنوں کے بارے میں واقعات اور ساتویں باب میں متفرق حیرت انگیز واقعات کا ذکر کر کے تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ آخری باب میں محقق نے اپنی تحقیق کا نتیجہ اخذ کیا ہے۔ محقق نے یہ تحقیقی نتائج کم و بیش پچاس خود نوشتوں سے دو سو کے قریب انتخاب کردہ واقعات کی روشنی میں اخذ کیے ہیں۔ سلمان علی کے نزدیک ان خود نوشتوں میں خرق عادات واقعات کا بیان کرنے کی وجہ انسان کے نفسیاتی محرکات ہیں جیسے کہ ان واقعات کا بیان حظ آفرینی کا باعث بنتے ہیں۔ مزید انسان کی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل ممکن ہوتی ہے اور مافوق الفطرت طاقتوں پر انسانی فتح کے لئے ایک طرح سے رہنمائی میسر آتی ہے۔ ہمارے ادب نے چونکہ داستانوں اور مثنویوں سے ارتقاء حاصل کیا ہے اور ان دونوں اصناف میں مافوق الفطرت واقعات کا بیان ہونا معمولی بات ہے، لہذا اس کے اثرات بھی خود نوشتوں پر پڑے ہیں۔ ان محیر العقول واقعات اور روایات کے پیچھے ہماری ضعیف الاعتقادی بھی اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ مزید نرگسیت کا عنصر بھی ایسے واقعات کے بیان کرنے کے پیچھے بطور محرک، کردار ادا کرتا ہے کہ انسان اپنی ذات کی تشہیر کرنے لگتا ہے۔ غرض محقق نے اپنی تحقیق میں خرق عادات واقعات کی حقانیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور ان چیزوں کے بیان کو سماج کی ترقی میں رکاوٹ سمجھا ہے۔

اطہر قسیم نے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل)، اسلام آباد سے ۲۰۰۷ء میں ڈاکٹر محمد آفتاب احمد کی نگرانی میں، "اردو ادب کی آپ بیتیاں۔ تحقیقی و تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا۔ مقالہ نگار نے پہلے باب میں آپ بیتی کی روایت کو انگریزی، عربی، فارسی اور اردو زبان میں بیان کرتے ہوئے نیز اس صنف کے فن، اسلوب اور تکنیک کا جائزہ مختلف ماہرین و ناقدین کی آراء سے لیتے ہوئے آپ بیتی کی صنف کو واضح کیا ہے۔ آپ بیتی کے فنی مباحث کے بیان میں مقالہ نگار کا یہ انداز انہیں دیگر مقالہ نگاروں سے منفرد بناتا ہے۔ مقالہ نگار کے نزدیک سوانحی ادب تین عناصر تاریخ، فرد اور کہانی پر اپنا وجود رکھتا ہے۔ ان عناصر کی موجودگی سے سوانح عمری ایک دلچسپ اور عمدہ دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

"سوانحی ادب در حقیقت تین بنیادی عناصر پر مشتمل ہے۔ تاریخ، فرد اور کہانی۔ کسی بھی سوانح عمری میں اگر یہ تینوں عناصر ایک خاص تناسب کے ساتھ موجود ہوں تو وہ ایک دلچسپ اور مضبوط سوانح گردانی جائے گی، بصورت دیگر اسے کمزور اور غیر دلچسپ تصور کیا جائے گا۔"(۷)

اس طرح مقالہ نگار کا آپ بیتی کے فن سے متعلق نقطہ نظر علم الدین سالک، ڈاکٹر وہاج علوی، ڈاکٹر عبد القیوم اور ڈاکٹر سید شاہ علی سے ملتا ہے جو آپ بیتی میں تاریخی و معاشرتی کشمکش کے اظہار کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ مقالہ نگار نے دوسرے باب میں آپ بیتی کے ابتدائی دور کا تذکرہ کیا ہے اور اولین آپ بیتی کے حوالے سے تحقیقی بحث کو شامل کیا ہے۔ اطہر قسیم نے تقسیم ہند سے قبل لکھی جانے والی اہم آپ بیتیوں کا سیاسی سماجی پس منظر میں مطالعہ کیا ہے۔ اس باب میں اطہر قسیم نے میر تقی میر کی آپ بیتی "ذکر میر" اور واجد علی شاہ کی آپ بیتی، "پری خانہ" کا سیاسی، سماجی و ادبی حوالے سے تجزیہ کیا ہے۔ اطہر قسیم نے اردو زبان میں لکھی گئی پہلی آپ بیتی علم الدین سالک اور عبد المجید قریشی کی تحقیق کی روشنی میں نواب صدیق حسین خان کی آپ بیتی، "البقا المنن بالقاالمنن" (۱۸۸۵ء) کو اولین آپ بیتی قرار دیا ہے۔ خواتین کی اولین آپ بیتی معین الدین عقیل کی تحقیق کی روشنی میں شہر بانو بیگم کی, "بیتی کہانی" کو قرار دیا ہے۔ حیرت ہے کہ مردوں کی اولین آپ بیتی کے حوالے سے مقالہ نگار نے معین الدین عقیل کی تحقیق کو بغیر کسی وجہ کے وقعت نہیں دی۔ کیونکہ معین الدین عقیل نے اردو کی اولین خود نوشت طیب جی بھائی میاں کی سوانح "حاجی الحرمین شرفین ملا طیت علی بن بھائی میاں، بقلم خود (۱۸۶۲ء)" کو قرار دیتے ہیں۔ مقالہ نگار نے ادبی حوالے سے پہلی آپ بیتی عبد الغفور نساخ کی۔ "حیات نساخ" کو قرار دیا ہے۔ اس باب میں منتخب آپ بیتیاں کم و بیش وہی ہیں جو ڈاکٹر نوشاد عالم نے اپنی تصنیف "اردو خود نوشت سوانح حیات۔ آزادی کے بعد" میں بیان کی ہیں۔ مقالے کے تیسرے باب میں اطہر قسیم نے بیسویں صدی میں لکھی جانے والی اہم آپ بیتیوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان آپ بیتیوں میں اہم آپ بیتیاں عبد المجید سالک کی "سرگزشت"، اعجاز حسین کی "میری دنیا"، یوسف حسین خان کی "یادوں کی دنیا"، جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی بارات"، احسان دانش کی "جہان دانش"، مرزا ادیب کی "مٹی کا دیا"، قدرت اللہ شہاب کی "شہاب نامہ"، ڈاکٹر وزیر آغا کی "شام کی منڈیر سے"، اختر حسین رائے پوری کی "گرد راہ" شامل ہیں۔ چوتھے باب میں خواتین کی آپ بیتیوں کو تحقیقی و تنقیدی نگاہ کا مرکز بنایا ہے۔ ہندوستانی خواتین آپ بیتی نگاروں کی آپ بیتیوں کا عمومی طور پر جائزہ لیا ہے جب کہ پاکستانی خواتین آپ بیتی نگاروں حمیدہ اختر، کشور ناہید، ادا جعفری وغیرہ کی آپ بیتیوں کا خصوصی جائزہ لے کر ان کے اسلوب، ادبی رجحانات اور انداز فکر کے متعلق قاری کو معلومات دی ہیں۔ پانچویں باب میں محقق نے بیسویں صدی میں اردو ادب میں دیگر مقبول عام ہونے والی آپ بیتیوں جیسے اعمال نامہ (سر رضا علی)، ناقابل فراموش (دیوان سنگھ مفتون)، در دل کشا (شیخ منظور الہی)، یاد عہد رفتہ (عبادت بریلوی)، اس آباد خرابے میں (اختر الایمان) اور چراغوں کا دھواں (انتظار حسین) وغیرہ کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اسی باب میں محقق نے ڈاکٹر وزیر آغا کی آپ بیتی، "آدھی صدی کے بعد"، اور حمایت علی شاعر کی آپ بیتی، "آئینہ در آئینہ" کا بھی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ چھٹے باب میں محقق نے اکیسویں صدی میں تحریر کی جانے والی چند اہم آپ بیتیوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے جس میں ڈاکٹر رشید امجد کی "تمنا بیتاب"، ڈاکٹر جاوید اقبال کی "اپنا گریباں چاک"، ڈاکٹر سلیم اختر کی "نشان جگر سوختہ" وغیرہ شامل ہیں۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ڈاکٹر اطہر قسیم کی اس تحقیق کو جانچنے اور پرکھنے کے مرحلے میں احساس ہوا کہ ڈاکٹر اطہر قسیم اور ہندوستان سے ڈاکٹر نوشاد عالم کے آپ بیتیوں پر تحقیقی کام میں یکسانیت ہے۔ڈاکٹر اطہر قسیم کا موقف ہے کہ

> "میں نے پی ایچ ڈی کی سطح پر اپنے کام کا آغاز ۲۰۰۲ء میں کر دیا تھا اور اپنا تحقیقی کام ۲۰۰۵ء میں مکمل کر چکا تھا لیکن اپنی تحقیق کا دفاع جامعہ میں سندی تحقیق میں درپیش مشکلات کی وجہ سے ۲۰۰۷ء میں کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔"(۸)

ڈاکٹر اطہر قسیم کے پی ایچ ڈی کے مقالے پر بھی جون ۲۰۰۷ء کا وقت تحریر ہے۔(۹) ڈاکٹر محمد نوشاد عالم کا پی ایچ ڈی پر کام پاکستانی اردو ناولوں پر ہے، انہوں نے ایم فل کی سطح پر آپ بیتیوں پر کام ڈاکٹر مظہر حسین کی نگرانی میں، جواہر لال یونی ورسٹی سے کیا اور اُن کے مقالے کا عنوان "اردو میں ادباء و شعراء کی خود نوشت سوانح ۱۹۸۰ء کے بعد" تھا۔ ڈاکٹر نوشاد عالم نے اپنے ایم فل کا دفاع ۲۰۰۵ء میں کیا۔ جس کا حوالہ انہوں نے اپنی تصنیف "اردو میں ادباء و شعراء کی خود نوشت سوانح ۱۹۸۰ء کے بعد" (مطبوعہ ۲۰۱۱ء) کے پاورق میں دیا ہے۔(۱۰) شاہانہ مریم شان نے بھی اپنی تصنیف "ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق" میں ڈاکٹر نوشاد عالم کی ایم فل کے مقالے کے دفاع کا وقت ۲۰۰۵ء ہی تحریر کیا ہے۔(۱۱) تاہم ڈاکٹر نوشاد عالم کی ایم فل سطح پر تحقیق کا عنوان اور ان کی مطبوعہ تصنیف کا عنوان دونوں مختلف نوعیت کے تحقیقی کام کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نوشاد عالم کا موقف یہ ہے کہ

> "میرا پی ایچ ڈی کا ٹائیٹل پاکستانی ناول کے اوپر ہی ہے لیکن ایم فل کا ٹائیٹل آپ بیتی کے اوپر تھا، جسے بعد میں کتابی شکل میں ٹائیٹل میں تبدیلی کے بعد پبلش کرایا"(۱۲)

دونوں محققین کے مماثل تحقیقی کام کو واضح کرنے کی غرض سے ان دونوں محققین کی تحریر سے کچھ حوالے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اطہر قسیم اور ڈاکٹر نوشاد عالم کی تحقیق کو پڑھنے کے بعد ایک قاری اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ ڈاکٹر اطہر قسیم نے اپنے مقالے میں جو تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے وہ کسی قدر مفصل ہے اور جامع ہے جبکہ نوشاد عالم کی تصنیف میں دی جانے والی معلومات سرسری نوعیت کی ہیں۔

تحقیق از ڈاکٹر اطہر قسیم	تحقیق از ڈاکٹر نوشاد عالم
۱۔ انکشاف ذات کا رجحان ہمیشہ سے انسانی فطرت کا حصہ رہا ہے۔ اپنی ذات کے بارے میں اظہار خیال کرنا اور اپنے تجربات میں دوسروں کو شریک کرنے کا سلسلہ بہت قدیم ہے۔(ص:xii) ۲۔ کسی معروف شخص کا اپنی شخصیت کو تحریری انداز میں اس طرح منظر عام پر لانا کہ وہ اپنی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو	۱۔ انکشاف ذات کا رجحان انسانی فطرت میں شامل ہے۔ اپنی ذات کے بارے میں اظہار خیال کرنا اور اپنے تجربات و مشاہدات میں دوسروں کو شامل کرنے کا رواج ہمیشہ رہا ہے۔ (ص:۶) ۲۔ کسی بھی مشہور و معروف شخص کا اپنی ذات اور شخصیت کو تحریری شکل میں اس طرح قارئین کے سامنے پیش کرنا کہ وہ

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

پوشیدہ نہ رکھے بلکہ اپنے محاسن و معائب کو دوسروں کے سامنے بے دھڑک پیش کر دے آپ بیتی کہلاتا ہے۔(ص:۲)	اپنی فطرت وسیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رکھے بلکہ اپنی اچھائیوں اور برائیوں کو خوبصورت انداز میں دوسروں کے سامنے بے باکانہ انداز میں پیش کر دے آپ بیتی کہلاتا ہے۔ (ص:٦)
۳۔ مغربی ادب میں آپ بیتی: قدیم مذہبی کتابوں میں لکھے گئے مختلف ادوار کے حالات و واقعات کو اگرچے آپ بیتی کے ابتدائی نقوش کہا جاسکتا ہے لیکن انگریزی ادب میں Autobiography کی اصطلاح باقاعدہ طور پر اٹھارویں صدی میں استعمال ہوئی۔ اس سلسلے میں ریحانہ خانم لکھتی ہیں:(یکساں حوالہ جاتی اقتباس) (ص:۲)	۳۔ مغرب میں آپ بیتی: زمانہ قدیم کی مذہبی کتابوں میں لکھے گئے مختلف ادوار کے حالات وواقعات کو ہم آپ بیتی کے ابتدائی نقوش کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے برعکس انگریزی ادب میں خود نوشت سوانح عمری (Autobiography) کو باقاعدہ اصطلاح کے طور پر اٹھارویں صدی عیسوی میں استعمال کیا گیا۔ ریحانہ خانم اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں:(یکساں حوالہ جاتی اقتباس)(ص: ۱۵)
۴۔ عیسائی مذہب میں اعتراف کا رواج بھی آپ بیتی کی ابتدائی شکل کو اجاگر کرتا ہے۔ عیسائیت میں کوئی شخص گناہ کرنے کے بعد جب اپنے گناہ کا برملا اعتراف کرلے تو وہ پھر سے اسی طرح معصوم ہو جاتا ہے جیسا وہ گناہ کے سرزد ہونے سے پہلے تھا۔ چونکہ آپ بیتی میں بھی مصنف اپنی زندگی کے پوشیدہ حالات و واقعات منظر عام پر لا کر ایک طرح سے اعتراف کے عمل سے گزرتا ہے لہذا آپ بیتی اعتراف ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس حوالے سے یوسف جمال انصاری یوں رقمطراز ہیں:(یکساں حوالہ جاتی اقتباس یوسف جمال انصاری) (ص:۳)	۴۔ عیسائی مذہب کی قدیم تہذیب بھی آپ بیتی کی ابتدائی شکل کو اجاگر کرتی ہے۔ عیسائیوں کے یہاں کوئی شخص گناہ کرنے کے بعد اگر اپنے گناہوں کا سب کے سامنے اعتراف کرلے، اسے پہلے کی طرح معصوم خیال کیا جاتا ہے، جیسے گناہ کرنے سے پہلے تھا۔ چونکہ خودنوشت سوانح عمری میں تخلیق کار اپنی زندگی کے پوشیدہ حالات وواقعات و تجربات و مشاہدات کو قارئین کے سامنے لا کر ایک طرح سے اعتراف کی عمل سے گزرتا ہے، لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اعتراف ہی خود نوشت سوانح عمری کا دوسرا نام ہے۔ اعتراف کے بارے میں یوسف جمال انصاری ایک جگہ لکھتے ہیں: (یکساں حوالہ جاتی اقتباس یوسف جمال انصاری(ص:۱٦)
۵۔ مشرق کی نسبت مغرب میں بہت سی سماجی و معاشرتی برائیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ خاص طور پر جنسی بے راہ روی، جسے مشرقی معاشرہ فحاشی کے دائرے میں لے آتا ہے وہاں معمول کی بات	۵۔ مشرق کی بانسبت مغرب میں ایسی سماجی و معاشرتی برائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جسے مشرقی سماج میں فحاشی سمجھا جاتا ہے۔ مغربی ادب میں جنسی پہلوؤں کو بے باکانہ انداز میں بیان کرنا

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

سمجھی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ مغرب میں آپ بیتی نگار جب اپنی زندگی کے جنسی پہلوؤں کو پوری جزئیات و تفصیلات کے ساتھ بیان کرتے ہیں تو معاشرے میں کسی قسم کی ہیجانی کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور ایسی تحریروں کو پڑھنے کے بعد لوگوں کا ردعمل اتنا شدید نہیں ہوتا جیسا عموماً ہمارے ہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ مغربی ادب میں پائے جانے والے اس جنسی رجحان نے ہندوستان کے ادب پر بھی اثرات ظاہر کیے ہیں جنہیں جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی "یادوں کی بارات" اور سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔(ص:۵)

معمولی بات ہے۔ جبکہ مشرق میں جب کوئی تخلیق کار اپنے جنسی پہلوؤں کو عوام کے سامنے پیش کرتا ہے تو اسے شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود مشرقی ادب پر بھی جنسی رجحانات کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جنسی رجحان کو جوش کی آپ بیتی "یادوں کی بارات"، زبیر رضوی کی "گردش پا"، اور سعادت حسن منٹو کے افسانوں وغیروں میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔(ص:۱۹)

۶۔ عربی ادب میں آپ بیتی کی روایت خاصی مضبوط ہے۔ علماے اسلام میں امام غزالی، ابن الجوزی اور ابن خلدون نے آپ بیتیوں کی شکل میں اپنی زندگی کے مشاہدات و تجربات بیان کئے ہیں۔ عصر حاضر میں عربی ادب کی نامور شخصیت طٰہٰ حسین کی آپ بیتی "الایام" نے خاصی شہرت پائی اور اسی طرح وزارت معارف اور جامعہ دول العربیہ (عرب لیگ) کے ثقافتی شعبوں کے ڈائریکٹر اور جامعہ مصریہ میں ادب عربی کے پروفیسر ڈاکٹر احمد امین کی خود نوشت "حیاتی" عربی آپ بیتی کی روایات میں ایک معتبر حوالہ ہے۔ عربی زبان میں لکھی گئی بیشتر آپ بیتیوں کا صاحبان علم آدب نے اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ جس کے براہ راست اثرات اردو ادب کی آپ بیتی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ (ص:۸)

۶۔ عربی زبان وادب میں بھی آپ بیتی کی روایت خاصی مضبوط ہے۔ حضرت امام غزالی، ابن الجوزی اور ابن خلدون وغیرہ نے اپنی زندگی کے حالات وواقعات اور تجربات ومشاہدات کو آپ بیتی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ دور جدید کے پیش کاروں میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی آپ بیتی "الایام" کے نام سے لکھی۔ جس کی شہرت خوب ہوئی علاوہ ازیں پروفیسر احمد امین کی خود نوشت سوانح عمری "حیاتی" کو بھی کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ عربی زبان میں لکھی خود نوشت سوانح عمریوں کا ترجمہ اردو میں کیا گیا۔ عربی ادب کے اثرات براہ راست اردو ادب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔(ص:۲۲)

۷۔ علامہ اقبال کے خطوط کے متعدد مجموعے بھی شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں عطیہ فیضی کے نام خطوط کی ادبی و تاریخی حیثیت مسلمہ ہے۔ ان خطوط سے اقبال کی شخصیت کے پوشیدہ خدوخال نمایاں ہوتے ہیں اور قارئین کو اس بات کا پتہ چلتا

۷۔ علامہ اقبال کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں انہوں سے جو خطوط عطیہ فیضی کے نام لکھے ہیں ان کی ادبی و تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ ان خطوط کے ذریعے علامہ اقبال کی ذاتی شخصیت اجاگر ہو کر سامنے آتی ہے۔ (ص:۲۹)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ہے کہ اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں عطیہ فیضی کا کیا کردار ہے۔ (ص:۱۷)	
۸۔ اردو ادب میں روزنامچہ بطور صنف ادب کچھ زیادہ فروغ نہ پا سکا۔ البتہ انگریزی ادب میں Diary لکھنے کی روایت خاصی دیر سے قائم ہے۔ ہندوستان کے مغل بادشاہوں نے جو روزنامچے لکھے بعد میں وہی تزکیں ان کی خود نوشتیں کہلائیں۔ (ص:۱۹)	۸۔ اردو ادب میں روزنامچہ کی اہمیت کچھ خاص نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ صنف اردو ادب میں کچھ زیادہ فروغ پا سکی۔ جہاں تک انگریزی ادب کی بات ہے تو اس میں ڈائری لکھنے کی روایت بہت قدیم ہے۔ ہندوستان کے مغل بادشاہوں نے جو روز نامچے لکھے بعد میں وہی تزکیں ان کی خود نوشتیں کہلائیں (ص: ۳۱)
۹۔ اردو میں تذکرہ نگاری کا رواج خاصا پرانا ہے۔ ابتدا ہی سے اس پر فارسی کے اثرات نمایاں رہے۔ اردو کا پہلا دستیاب تذکرہ میر تقی میر کا "نکات الشعراء" ہے۔ میر کے علاوہ میر حسن اور مصحفی کے تذکروں سے لے کر مولانا محمد حسین کی "آب حیات" تک اردو تذکروں کا دور نظر آتا ہے۔ مولوی عبدالحق، مرزا فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی نے اصناف ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ (ص:۲۰)	۹۔ اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس صنف پر ابتدا ہی سے فارسی ادب کے اثرات نمایاں رہے ہیں۔ اردو کا پہلا دستیاب اور قابلِ ذکر تذکرہ میر تقی میر کا "نکات الشعراء" ہے۔ میر کے علاوہ مصحفی کا "تذکرہ ہندی"، شیفتہ کا "گلشن بے خار" اور محمد حسین آزاد کا "آب حیات" وغیرہ قابل ذکر تذکرے ہیں۔ مولوی عبدالحق، مرزا فرحت اللہ بیگ، اور رشید احمد صدیقی نے اس صنف کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ (ص:۳۲)
۱۰۔ "داستان غدر" ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں لکھی گئی ایک اہم قابل ذکر آپ بیتی ہے۔ اس کا شمار اردو کی ابتدائی آپ بیتیوں میں ہوتا ہے۔ ظہیر دہلوی کا پورا نام سید ظہیر الدین دہلوی تھا۔ وہ ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بطور دوراغہ کام کرتے تھے۔ (ص:۵۰)	۱۰۔ ظہیر دہلوی کی "داستان غدر" جنگ آزادی کے پس منظر میں لکھی گئی ایک اہم قابل ذکر آپ بیتی ہے۔ اس کا شمار اردو کی ابتدائی آپ بیتیوں میں ہوتا ہے۔ ظہیر دہلوی کا پورا نام سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی تھا۔ وہ ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بطور دوراغہ کام کرتے تھے۔ (ص:۴۸)
۱۱۔ آپ بیتی میں مجموعی طور پر الہ آباد یونیورسٹی کی یادوں کو بڑے جذباتی انداز کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خاص طور پر شعبہ اردو کی روایتوں، مجلسوں، ادبی نشستوں اور	۱۱۔ آپ بیتی میں الہ آباد یونیورسٹی کی یادوں کو بڑے جذباتی انداز سے پیش کیا ہے۔ شعبہ اردو کی روایتوں، ادبی نشستوں، مجلسوں، مباحثوں اور مذاکروں کا ذکر اتنے خوبصورت انداز میں کیا ہے کہ ہر جگہ دلچسپی کا عنصر قائم رہتا ہے۔ (ص:۶۷)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

مذاکروں کا تذکرہ اتنے خوبصورت انداز میں کیا ہے کہ ہر جگہ دلچسپی کا عنصر قائم رہتا ہے۔(ص:۸۴)	
۱۲۔ آپ بیتی جہاں سماج اور عہد کی پوری طرح عکاسی ہوتی ہے وہاں کلیم الدین احمد کی اپنی شخصیت دب کر رہ گئی ہے۔ آپ بیتی میں اپنے آپ کو چھپانا یا زندگی کے مخصوص گوشوں کو پوشیدہ رکھنا آپ بیتی کا ایک بڑا عیب تصور کیا جاتا ہے۔(ص:۱۳۲)	۱۲۔ آپ بیتی میں جہاں سماج اور عہد کی پوری عکاسی ہوتی ہے وہیں مصنف نے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت کم لکھا ہے اور وہاں سرسری طور پر گزر گئے ہیں۔ جس سے ان کی شخصیت دب کر رہ جاتی ہے۔ آپ بیتی میں اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنا آپ بیتی کا عیب تصور کیا جاتا ہے۔(ص:۷۶)
۱۳۔ جوش کی آپ بیتی میں معاشقوں کا تذکرہ خاص اہتمام کے ساتھ کیا گیا۔۔۔۔ "یادوں کی بارات" میں جوش ملیح آبادی نے مشاہیر اور معاصرین کا تذکرہ بھی اپنی خاص طرز فکر کے ساتھ کیا۔ سرسید احمد خان کا ذکر کرتے ہوئے انہیں ایک خوشامدانہ ذہنیت رکھنے والا شخص قرار دیتے ہیں۔۔۔۔ آپ بیتی میں جوش گاندھی جی کو ہندوستان کا عظیم محسن قرار دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ یہ ان کی بے شمار خوبیوں کو سراہنے کے باوجود انہیں انسانی شادمانی کا بدترین دشمن قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گاندھی مے خوری اور عصمت فروشی کا سدباب چاہتے تھے۔ جوش کے نزدیک یہی دو چیزیں انسانی شادمانی کے لئے ضروری ہیں۔(ص:۱۰۳-۱۰۴)	۱۳۔ یادوں کی بارات میں معاشقوں کا تذکرہ اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف اپنی اس کتاب میں اپنے مشاہیر معاصرین کا ذکر بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ سرسید احمد خان کو خوش آمدانہ (خوشامدانہ) ذہنیت رکھنے والا شخص قرار دیتے ہیں۔ جبکہ گاندھی کو ہندوستان کا عظیم محسن قرار دینے کے ساتھ ہی ان کی خوبیوں کو سراہنے کے باوجود انہیں انسانی شادمانی کا بدترین دشمن بھی قرار دیتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ گاندھی جی میخوری اور عصمت فروشی کا خاتمہ چاہتے تھے۔ یہ دونوں چیزیں انسانی شادمانی کے لئے ضروری ہیں۔ (ص:۱۵۱)
۱۴۔ احسان دانش اپنی دردناک داستان لکھتے ہوئے درحقیقت اس سماج کی کہانی لکھتے ہیں۔ جہاں بہت سے غریب گھرانوں میں آرزوؤں، امیدوں اور ارمانوں کے چراغ ذرہ سے ٹمٹما کر ہمیشہ کے لیے گل ہو جاتے ہیں۔ احسان دانش اپنے حوصلے اور جواں مردی کے باعث اپنے غموں کا بیان کرتے ہوئے اپنی مظلومیت کا رونا نہیں روتے بلکہ دوسروں کو سختیوں کا مقابلہ کرنے کا ہنر سکھاتے ہیں۔ اپنی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک جگہ	۱۴۔ احسان دانش نے اپنی داستان حیات کو قلم بند کرتے ہوئے دراصل اس معاشرے کی کہانی کو قلم بند کیا ہے جہاں غریب گھرانوں کے آرزوؤں، امیدوں اور ارمانوں کا چراغ جلنے سے پہلے ہی بجھ جاتے ہے یا بھلا دیا جاتا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے غموں اور پریشانیوں کو بیان کرتے ہوئے روتے نہیں بلکہ دوسروں کو اس کا مقابلہ کرنے کی ترغیب اور ہمت دلاتے ہیں کہ کیسے غموں اور پریشانیوں کا سامنا کیا جائے۔ ایک جگہ اپنی سیاسی بصیرت کا

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

لکھتے ہیں: " مزدور اور کسانوں سے ناانصافی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔"(ص:۱۱۶-۱۱۷)	ثبوت کچھ اس طرح دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ " مزدور کسان سے ناانصافی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔"(ص:۱۵۴)

آخری باب میں اطہر قسیم نے اپنی تحقیق کا تین حوالوں، جیسے اردو ادب کی آپ بیتیوں، غیر ادیب شخصیات کی آپ بیتیوں اور ترجمہ شدہ آپ بیتیوں کا اجمالی جائزہ لے کر نتائج اخذ کئے ہیں کہ آپ بیتی میں فنی اعتبار سے ادبیت کا عنصر ناگزیر ہے اور پاک وہند میں لکھی جانے والی اکثر آپ بیتیوں میں آپ بیتی نگاروں نے سوانحی حالات و واقعات بیان کرنے کی بجائے سفر ناموں، مذاکروں اور مشاعروں کی مفصل روداد کو بیان کیا ہے۔ مزید یہ کہ مجموعی طور پر بیسویں صدی میں آپ بیتی کی صنف میں خصوصی توجہ دی گئی ہے اور اس صنف میں خواتین بھی بڑی تعداد میں اپنی ذات کا اظہار کامیابی سے کر رہی ہیں۔

مسرت بانو نے ۲۰۱۶ء میں ڈاکٹر سید عامر سہیل کی نگرانی میں یونیورسٹی آف سرگودھا سے، "پاکستانی ادباء کی آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں تاریخی اور تہذیبی شعور (۱۹۴۷ سے تاحال)" کے عنوان سے مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ محققہ نے اپنی تحقیق کے پہلے باب میں پاکستان میں تاریخی و تہذیبی تناظر کے حوالے سے بحث کی ہے۔ پہلے باب میں مسرت بانو پاکستانی تہذیب کی تشکیل میں رکاوٹ بننے والے عوامل کی تلاش میں ہیں اور ان کا استدلال ہے کہ تاریخ کے مروجہ نصابی بیانیے ان عوامل کی تلاش میں کافی نہیں ہے لہذا خود نوشتوں اور یاداشتوں سے استفادہ ضروری ہے۔ محققہ کا خیال ہے کہ انسانی زندگی خلا میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ سماج میں رہ کر گزرتی ہے اس لئے خود نوشتوں میں ثقافتی، سیاسی، تہذیبی، مذہبی اور معاشی حالات و واقعات بھی ان خود نوشتوں میں شعوری یا لاشعوری طور پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے ادباء کی آپ بیتیاں اور یادداشتیں تہذیبی اعتبار سے اہم دستاویز ثابت ہو سکتی ہیں۔ دوسرے باب میں مسرت بانو نے آپ بیتی کے مفہوم اور آپ بیتی کے نظری مباحث کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے بنیادی فنی اصولوں اور ان کی اہمیت بھی قلم بند کی ہے۔ اس باب میں محققہ نے خود نوشت اور سوانح نگاری اور یادداشتوں کے مابین پائے جانے والے فرق کو بھی بیان کیا ہے۔ مسرت بانو آپ بیتی کے مفہوم کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں:

> "آپ بیتی کسی شخص کی زندگی کی کہانی کی زبانی ہوتی ہے۔ یہ اس کی زندگی کے اہم واقعات و حالات کا تدریجی اور ترتیب وار بیان ہوتا ہے۔ آپ بیتی انسان کے ماضی کی داستان ہے جس میں اس کی زندگی کے پوشیدہ راز محفوظ ہوتے ہیں جنھیں وہ تصور کے کدال سے کھودتا ہے اور تخیل کی کرنوں سے چمکاتا ہے۔"(۱۳)

محققہ سمجھتی ہیں کہ آپ بیتی کو عمر کے آخری حصے میں لکھنا چاہیے اور آپ بیتی کسی شخصیت و کردار کے ساتھ ساتھ اس کے سماج کی بھی آئینہ دار ہوتی ہے۔ انھوں نے سوانح نگاری، خود نوشت سوانح اور آپ بیتی میں فرق اور اشتراک کو مختلف ماہرین کی آراء کے ساتھ بیان کیا ہے۔ محققہ کے نزدیک سوانح نگاری اور خود نوشت سوانح نگاری کے لیے فنی اصول و ضوابط یکساں ہے فرق یہ ہے کہ سوانح نگاری میں سوانح نگار کسی دوسرے شخص کی کہانی سناتا ہے اور خود نوشت سوانح میں خود نوشت نگار اپنی زندگی کی کہانی سناتا ہے۔ مسرت بانو خود نوشت سوانح نگاری اور آپ بیتی میں پائے جانے والے فرق کو بھی واضح کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ فرق ہمیں صبیحہ انور کی تحقیق میں نظر

آیا تھا۔ لیکن صبیحہ انور کی تحقیق میں یہ فرق زیادہ واضح نہیں تھا مسرت بانو اس فرق کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> " حقیقت یہ ہے کہ ہر آپ بیتی خود نوشت سوانح ہوتی ہے مگر ہر خود نوشت سوانح کو آپ بیتی نہیں کہا جا سکتا۔ آپ بیتی خود نوشت سوانح عمری ہے تاہم آپ بیتی اور خود نوشت سوانح عمری میں ایک لطیف فرق ضرور ہے جس کی بنیاد لکھنے والے کے طرز احساس، انداز نظر اور انداز بیاں پر ہوتی ہے۔ خود نوشت سوانح عمری کسی شخص کی زندگی کے حالات و واقعات کا تاریخ وار اور مستقیم بیان ہوتا ہے لیکن آپ بیتی لکھنے والے کے جذبات واحساسات بھی صفحہ قرطاس پر بکھرے نظر آتے ہیں۔ خود نوشت نگار بیان کرتا ہے کہ کیا ہوا، جب کہ آپ بیتی نگار یہ بھی بیان کرتا ہے کیوں ہوا، کیسے ہوا اور اس واقعہ کا اس پر کیا اثر ہوا؟"(۱۴)

مسرت بانو کی تحقیق میں چونکہ یاداشتیں بھی شامل ہیں اس لیے انہوں نے یادداشتوں و آپ بیتی کے مابین فرق کو بھی واضح کیا ہے۔ محققہ نے آپ بیتی کی صنف کے نظری مباحث میں پیش آنے والی مشکلات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک عمدہ آپ بیتی لکھنے کے لیے چند لوازمات اور عناصر کو بیان کیا ہے۔ ہمیں یہ لوازمات و عناصر ریحانہ خانم، ڈاکٹر سید عبداللہ، صبیحہ انور، وہاج الدین علوی اور صفدر رانا کی تحقیق میں بھی نظر آتے ہیں۔ محققہ سمجھتی ہیں کہ آپ بیتی لکھنے کے کوئی بندھے ٹکے اصول مرتب نہیں ہیں تاہم آپ بیتی میں من گھڑت واقعات اور غلط بیانی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مسرت بانو نے آپ بیتی کی اہمیت میں وہی باتیں دہرائیں ہے جو ہمیں علم الدین سالک اور صبیحہ انور کی تحقیق میں نظر آتی ہیں تاہم محققہ دوسرے باب کے آخر میں آپ بیتی اور یادداشتوں کے ادبی محاسن پر چند مفید معلومات مہیا کی ہے اور ان اصناف کے لیے عمدہ اسلوب اور تخلیقی اظہار و حُسنِ تناسب کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ مسرت بانو نے تیسرے باب میں چھتیس خود نوشتوں اور یادداشتوں کا اجمالی جائزہ لیا ہے اور پھر ان ہی خود نوشتوں اور یاداشتوں پر چوتھے باب میں تاریخی و تہذیبی عناصر کا مطالعہ کیا ہے۔ محققہ کی تحقیق کا چوتھا باب طویل ترین باب ہے۔ اس باب میں محققہ نے خود نوشتوں اور یاداشتوں سے بہت سے تاریخی وہ تہذیبی عناصر کی وضاحت کی ہے جیسا کہ قیام پاکستان کے بعد بیوروکریسی کی من مانیاں، قائداعظم کی بیماری کی وجہ سے عجلت میں فیصلے، لیاقت علی خان کی شہادت کا واقعہ، پاکستان کی خارجہ پالیسی کے ابتدائی نقوش، قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا معاملہ، مغربی پاکستان کو ون یونٹ بنانے کا اعلان، ملک پر مارشل لاء کے ذریعے فوج کی حکومت، محترمہ فاطمہ جناح کی الیکشن میں شکست، مسئلہ کشمیر پر بھارت سے تعلقات، پاک بھارت کی ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگیں، سقوط ڈھاکہ، بھٹو کی پھانسی اور اس کے اثرات۔ ان سب عناصر کا مسرت بانو نے خود نوشتوں اور یادداشتوں کے ذریعے مطالعہ کر کے تاریخ کی سمت درست کرنے کی کوشش کی ہے۔ محققہ نے خود نوشتوں اور یاداشتوں سے تہذیبی شعور کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر مسلمان گھرانوں میں بچوں کی مذہبی تربیت، صدقہ خیرات اور دوسروں کی مدد کا جذبہ، والدین کی خدمت، ولی اللہ اور بزرگان دین کے مزارات کی تعظیم، لوگوں کی ضعیف الاعتقادی، تہواروں (شب برات، عیدین، دیوالی) کا منانا، گھروں میں پالتو جانور رکھنے کا رواج اور پردے کی پابندی، محرم کے ایام میں مجالس کا اہتمام، شادی اور موت پر رسوم و رواج، مہمانوں کا احترام، لباس اور طعام کے طریقے، مشاعروں کا احوال، بچپن میں مشاغل، مکانات کی تعمیر کے انداز اور رہن سہن،

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

لڑکے اور لڑکیوں کی نسبت کرنے کی رسم وغیرہ بیان کر کے پاکستانی معاشرے کی تہذیبی حوالے سے پہچان کرانے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ یہ تہذیبی عناصر ہندوستانی تہذیب کے ساتھ اس قدر خلط ملط ہیں کہ ان کو آسانی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ مسرت بانو نے آخری باب میں اپنی تحقیق کی تلخیص بیان کی ہے اور اپنی تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پاکستان کے تمام علاقوں میں تہذیب کے بنیادی اصول یکساں ہیں لیکن ان کے ظاہری خدوخال میں کسی حد تک انفرادیت جھلکتی ہے۔ یہ آپ بیتیاں اور یادداشتیں ایک خاص دور کی تہذیب و تاریخ کا مستند درجہ رکھتی ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی وجہ سے اب تہذیبوں کا آپس میں ٹکراؤ شروع ہو چکا ہے۔ لہذا پاکستانی ادباء کی آپ بیتیوں میں محفوظ یہ تہذیبی نقوش آئندہ سماجی مورخ کے لیے بنیادی ماخذ کے طور پر مددگار ہوں گی۔

محمد سلیم نے بھی ۲۰۱۶ء میں ڈاکٹر سلمان علی کی نگرانی میں قرطبہ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی حیات آباد پشاور سے، "قیام پاکستان کے بعد حکمرانوں اور سیاستدانوں کی منتخب آپ بیتیاں" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ مقالہ نگار نے پہلے باب میں آپ بیتی کی تعریف، فن، تاریخ و ارتقاء اور آپ بیتی کے اصولوں پر بحث کی ہے۔ مقالہ نگار نے آپ بیتی کی صنف کے متعلق اپنی رائے کو اس طرح بیان کیا ہے:

> "آپ بیتی ادب کی وہ اہم صنف ہے جو انسان کی ذاتی زندگی کے اہم حالات و واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے جس میں فرد نے اپنے احساسات، تجربات، معلومات، مشاہدات، نظریات، خیالات اور شخصیت کے داخلی اور خارجی کیفیات من و عن اس طرح پیش کرتا ہے جس طرح اس کے مشاہدے میں آئے تھے۔"(۱۵)

محقق نے آپ بیتی کی روایت بھی بیان کی ہے اور کہا کہ اولین آپ بیتی لکھنے کا شرف چینی عالم، تاریخ دان، اور مفکر سیچان کی خودنوشت "شی جی" کو حاصل ہے۔ اس ارتقائی سفر میں محقق نے روسو اور سینٹ آگسٹائن کے کردار کو بھی یاد رکھا ہے۔ محقق نے یورپ کے بعد مشرق میں آپ بیتی کے ارتقاء میں فارسی زبان کو اہم سمجھا ہے اور اردو میں پہلی باقاعدہ آپ بیتی جعفر تھانیسری کی "کالا پانی" کو قرار دیا ہے۔ محمد سلیم نے اردو میں آپ بیتی کے ارتقا میں پانچ ادوار کا ذکر کیا ہے کہ پہلے دور میں آپ بیتی کی ابتدائی شکل تذکروں، ملفوظات اور مکتوبات کے ذریعے سامنے آتی ہے۔ دوسرا دور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک کا ہے جس میں "کالا پانی"، "داستان غدر"، "ایام غدر" اہم آپ بیتیاں ہیں۔ تیسرا دور ۱۹۱۴ء تا ۱۹۴۷ء تک کا ہے۔ اس دور میں لکھی جانے والی آپ بیتیوں میں سیاسی اور فکری بیداری نمایاں ہے، اس دور میں اہم آپ بیتیاں قید فرنگ (حسرت موہانی)، میرا افسانہ (افضل حق) اور اعمال نامہ (سر رضا علی) ہیں۔ آپ بیتی کا چوتھا دور ۱۹۴۷ء تا ۱۹۸۰ء تک کا ہے، ان آپ بیتیوں میں فسادات، مہاجرت، معاشرتی و سماجی تبدیلیاں، فوجی حکومتیں اور سقوط ڈھاکہ جیسے اہم واقعات قلم بند ہوئے ہیں۔ آخری دور ۱۹۸۰ء تا موجودہ دور تک کا عرصہ ہے۔ مقالہ نگار نے دوسرے محققین کی طرح آپ بیتی کا تعلق ادب کی دوسری اصناف کے ساتھ جوڑا ہے۔ آپ بیتی کے فن کے حوالے سے آپ بیتی کے اسلوب اور آپ بیتی میں صداقت کے عنصر کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ محمد سلیم نے آپ بیتیوں کی چار اقسام بیان کی ہیں۔ ان کی یہ تقسیم زیادہ منطقی نظر آتی ہے۔ محمد سلیم نے دوسرے باب میں جن سیاسی آپ بیتیوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے ان میں بیگم شائستہ اکرام اللہ، منظور احمد وٹو، جاوید ہاشمی، یوسف رضا

گیلانی، گوہر ایوب خان، شیخ رشید، شجاعت حسین کی آپ بیتیوں کو شاملِ تحقیق کیا ہے۔ محقق نے تیسرے باب میں نامکمل آپ بیتیوں کا فکری و فنی جائزہ لیا ہے۔ ان آپ بیتیوں میں کوثر نیازی، الطاف حسین، بیگم کلثوم نواز، سید قمر عباس، اعتزاز احسن، محمد حنیف رامے اور راجہ انور کی آپ بیتیاں شامل ہیں۔ چوتھے باب میں ترجمہ شدہ آپ بیتیوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان آپ بیتیوں میں محمد ایوب خان، اجمل خٹک، بے نظیر بھٹو، عمران خان اور پرویز مشرف کی آپ بیتیاں شامل ہیں۔ الغرض محقق نے ان سیاسی آپ بیتیوں کے مطالعے سے سیاستدانوں کے ذاتی حالات، اہم انکشافات، سماجی تغیرات، تاریخی تبدیلیوں، کارناموں مبالغہ آرائیوں، نرگسی رویوں، سیاسی حوادث، اخلاقی اور ان کے موجودہ مقام تک پہنچنے میں انہیں جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا، ان کو تحقیقی و تنقیدی نظر سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان ہی سے حافظہ شہلا اقبال نے ڈاکٹر روبینہ ترین کی نگرانی میں ۲۰۱۷ء میں، "اردو میں خواتین کی ادبی خود نوشتیں (۱۹۴۷ء تا حال)" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ محققہ نے پہلے باب میں خواتین کو سماج میں پیش آنے والے مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے سماجی مقام کو برصغیر میں مختلف تہذیبوں جیسے موہنجوداڑو، آریا، اسلام کے تناظر میں بیان کیا ہے۔ محققہ کے نزدیک برصغیر میں انگریزوں کی آمد تک یعنی انیسویں صدی تک خواتین کے لئے آزادی اظہار رائے کا امکان بہت کم تھا تاہم ترقی پسند تحریک نے اپنے دوررس اثرات مرتب کیے اور خواتین کو تعلیم کے میدان میں قدم رکھنے کا زیادہ سے زیادہ مواقع میسر آئے۔ یوں بیسویں صدی کے نصف تک بہت سی خواتین نے ادبی حوالے سے اپنی خدمات پیش کیں۔ آپ بیتی کی روایت میں محققہ کا خیال ہے کہ اردو ادب میں پہلی خود نوشت جعفر تھانیسری کی "تواریخ عجب (کالا پانی)" ہے اور خواتین میں پہلی خود نوشت شہر بانو بیگم کی "بیتی کہانی" (۱۸۸۱ء) ہے۔ محققہ کے نزدیک شہر بانو بیگم کا ایک غیر معروف صنف میں طبع آزمائی حیران کن ہے کیونکہ اس دور تک خواتین کو محض قرآن ہی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ شہلا اقبال نے خواتین کی آپ بیتیوں کی روایت میں عطیہ فیضی کے جزوی خود نوشت کا بھی تذکرہ کیا ہے جو ۱۹۲۱ء میں "زم ن ہ ت ح ص ی ل" کے عنوان سے لکھی گئی جس میں یورپ کے سفر کا احوال درج ہے۔ محققہ کے نزدیک یہ خود نوشت روزنامچہ کی تکنیک میں لکھی گئی ہے۔ شہلا اقبال لکھتی ہیں کہ

> "بیسویں صدی کے آخری دہائی میں خواتین کی آپ بیتیاں زیادہ مقبول ہونا شروع ہوئیں۔ اس دور میں نہ صرف ادبی بلکہ سیاسی آپ بیتیاں بھی لکھی گئیں۔"(۱۶)

محققہ نے پہلے باب میں کچھ سوالات کو اپنی تحقیق کا معیار بنایا ہے۔ ان سوالات میں، خاتون آپ بیتی نگار کا خاندانی پس منظر کیا ہے؟ خاتون آپ بیتی نگار آپ بیتی میں محض اپنے کردار کو پیش نظر رکھا یا دیگر کرداروں کو بھی اہمیت دی ہے؟ خاتون آپ بیتی نگار نے صداقت کے عنصر کو کتنا پیش نظر رکھا ہے اور اس کی اس کو کیا قیمت ادا کرنا پڑی ہے؟ آپ بیتی نگار نے کس قدر مبالغے سے کام لیا ہے کتنا اخفا کا مظاہرہ کیا ہے اور کس قدر اپنی خامیوں کا اعتراف کیا ہے؟ آپ بیتی تحریر کرنے کا کیا مقصد ہے؟ فنی اعتبار سے آپ بیتی کی صنف میں کیا تکنیک اختیار کی گئی ہے؟

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

حافظہ شہلا اقبال نے پہلے باب میں منتخب شدہ تحقیقی سوالات کی روشنی میں مقالے کے دوسرے باب میں اردو ادب میں خواتین کی خود نوشتوں (قیام پاکستان سے ۱۹۹۹ء تک) کا فکری و فنی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس باب میں محققہ نے آٹھ آپ بیتیوں کا انتخاب کیا ہے۔ جن میں ہندوستانی اور پاکستانی خواتین کی خود نوشتیں شامل ہیں۔ اس باب میں محققہ نے ادبی خود نوشتوں میں سوانحی ناول اور یادداشتوں کو بھی شامل کر لیا ہے۔ سوانحی ناول قرۃ العین حیدر کا "کار جہاں دراز ہے" اور یادداشتیں عذرا عباس کی (میرا بچپن) اور کشور ناہید (نوٹ بک) شامل ہیں۔ محققہ کی تحقیق کا تیسرا باب چودہ خواتین کی خود نوشت تصانیف پر مشتمل ہے۔ ان میں نثار عزیز بٹ، اختری بیگم، ثاقبہ رحیم الدین، شوکت کیفی، نور سجاد ظہیر، عطیہ داؤد، عمرانہ مقصود، بانو قدسیہ، فرخندہ بخاری، شین فرخ، رضیہ بٹ، حمراء خلیق، انیس ہارون، محمودہ بشیر کی تصانیف شامل ہیں۔ ان تصانیف میں بھی ثاقبہ رحیم الدین، نور سجاد ظہیر، عمرانہ مقصود اور محمودہ بشیر کی تصانیف خود نوشت ہونے کی بجائے یادداشتیں ہیں۔ محققہ نے خود نوشت اور یادداشتوں میں کوئی فرق روا نہیں رکھا ہے اور دونوں اصناف کو ایک ہی صنف کے ضمن میں تصور کیا ہے۔ حالانکہ ان دونوں اصناف کے درمیان واضح فرق ہے۔ یادداشت کو انگریزی زبان میں Memoir کہتے ہیں جو کہ فرانسیسی لفظ Memory سے نکلا ہے۔ یادداشت ادب کی ایک صنف ہے جہاں مصنف اپنے بچپن میں واپس جا کر اپنی یادوں کے متعلق لکھتا ہے، بسا اوقات یادداشتیں مصنف کی پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہیں، لیکن زیادہ تر وہ زندگی کے اہم حصوں کو توجہ کا مرکز بناتی ہیں۔ یادداشتیں اور آپ بیتی یکساں نوعیت کی اصناف ہیں۔ دونوں ہی صورتوں میں مصنف اپنی زندگی کی کہانی بیان کرتا ہے، لیکن یادداشت خود نوشت سوانح عمری کی ذیلی صنف میں شمار ہوتی ہے۔ یاد داشت اور خود نوشت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ یادداشتوں میں الگ تھلگ واقعات کا ذخیرہ پایا جاتا ہے جب کہ خود نوشت میں تمام یادیں ایک ہی کہانی میں مل جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں خود نوشت سوانح عمری مصنف کی تمام زندگی کا احاطہ کرتی ہے جیسے؛ بچپن، تعلیم، خاندانی تاریخ، اور پیشہ سے متعلق حقائق سے پردہ اٹھاتی ہے، جب کہ یادداشت زندگی کے صرف ایک، خاص اور اہم یا دلچسپ حصہ کا احاطہ کر سکتی ہے جو ایک خاص وقت اور جگہ پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ محققہ نے مسرت بانو کی طرح بانو قدسیہ کی آپ بیتی "راہ رواں" کو بھی فکری و فنی جائزے کے لیے منتخب کیا ہے۔ راہ رواں کو ہم مکمل طور پر آپ بیتی تصور نہیں کر سکتے اور یہ آپ بیتی سے زیادہ سوانح عمری ہے۔ پانچواں باب خواتین کی خود نوشتوں کے مرد خود نوشت نگاروں کے مابین امتیازی اوصاف پر مبنی ہے۔ محققہ کے نزدیک:

> "خواتین اور مردوں کی خود نوشتوں میں بنیادی فرق آزادی اظہار رائے اور بے باکانہ انداز بیاں ہے۔ مردوں کی خود نوشتوں میں خواہ شادی سے پہلے کے واقعات ہوں یا بعد کے وہ مختلف معاشقوں کو بے باکی سے بیان کرتے ہیں جبکہ خواتین کا جنسی جذبات کا اظہار نہ ہونے کے برابر ہے۔"(۱۷)

> "دوسرا فرق شریک حیات کی اہمیت کے حوالے سے کہ مردوں میں اس پہلو کو بیان نہیں کیا جاتا جبکہ خواتین کی خود نوشتوں میں اول تا آخر تک شوہر کا کردار چھایا برا نظر آتا ہے۔"(۱۸)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

"مردوں کی خود نوشتوں میں خارجی واقعات و حالات کا تذکرہ زیادہ ہوتا ہے جبکہ خواتین کی خود نوشتوں میں گھریلو زندگی یا رشتوں کے بارے میں تفصیلات زیادہ ملتی ہیں۔"(۱۹)

محققہ نے اسی باب میں مختلف خواتین خود نوشت نگاروں کا آپس میں بھی تقابلی جائزہ اپنی تحقیق میں مرتب کردہ سوالات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔

پاکستانی جامعات میں پی ایچ ڈی کی سطح پر مزید کام کرنے والے تحقیق کاروں میں حمیرہ ماجد اور انور علی ہیں۔ حمیرہ ماجد نے ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر سلیم اختر کی نگرانی میں جی سی یونیورسٹی سے "پاکستان میں اہم آپ بیتیوں کی تاریخ کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ انور علی نے ڈاکٹر صابر کلوروی کی نگرانی میں پشاور یونورسٹی سے "اردو آپ بیتیوں میں سوانحی مواد کا تحقیقی و توضیحی جائزہ" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ ڈاکٹر فہمیدہ تبسم کی نگرانی میں محمد زاہد عمر نے "اردو میں سوانحی دستاویزی ناول نگاری" کے عنوان سے ۲۰۱۷ء میں وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی اسلام آباد سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ پاکستانی جامعات میں آپ بیتی کے موضوع پر محررہ مقالات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ بیتی کی صنف میں ہونے والا تحقیقی کام سے آپ بیتی کی صنف مزید مقبول ہوئی ہے۔ آپ بیتیوں یا خود نوشتوں پر تحقیقی نوعیت کے کام سے اس صنف کے جو عمومی تقاضے ہیں وہ اپنی حیثیت کو منوا کر اس صنف میں ناگزیر حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ جن کی مدد سے محقق کے لیے اس صنف کی حدود و قیود کا تعین کرنے میں کسی حد تک آسانی ہو گئی ہے۔ آپ بیتیوں پر جامعات میں ہونے والی تحقیق سے یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ جہاں آپ بیتی کے لیے صداقت اور برملا گوئی از حد ضروری ہے وہاں شخصیت کے اظہار میں تاریخ کے تسلسل کو اس طور پیش کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کے دور کی مختلف تہذیبی اقدار کی بھی جھلک نمایاں ہو۔ واقعات کے انتخاب اور ان کے بیان کے لیے فنی اعتبار سے کوئی نہ کوئی تکنیک کا ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ بیتی یا خود نوشت کی صنف میں تحقیقی و تنقیدی کام ابتداء میں تو آپ بیتیوں کا محض فکری و فنی جائزہ لینے کی حد تک ہی محدود تھا۔ زیادہ تر محققین نے آپ بیتی پر جو تحقیقی و تنقیدی کام کیا ہے اس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ آپ بیتی میں تحریری واقعات دلکش ہیں، زبان سادہ اور سلیس ہے، انداز بیان شگفتہ اور شیریں ہے اور مصنف کو زبان و بیاں پر عبور حاصل ہے، یا پھر جو واقعات ان آپ بیتیوں میں بیان ہوئے ہیں ان کی صحت کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے۔ اس تحقیق کی بدولت ایک قاری یہی جان پاتا تھا کہ آپ بیتی یا خود نوشت میں مصنف نے اپنی ذات کا اظہار کس طرح کیا۔ کیا اس میں صداقت اور برملا گوئی سے اظہار کیا گیا یا مبالغہ آرائی اور اخفاء سے کام لیا گیا تاہم ایک قاری کا آپ بیتی کی صنف میں محض دلچسپی آپ بیتی نگار کی شخصیت تک ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے عہد کے سیاسی و سماجی، ثقافتی و تہذیبی عناصر سے بھی ہوتی ہے۔ جس طرح کوئی آپ بیتی محض ذات کے اظہار سے زندہ جاوید نہیں رہ سکتی اسی طرح ایسی تنقید جو آپ بیتی کے تحقیقی مطالعے میں آپ بیتی یا خود نوشت میں موجود تہذیبی اقدار اور تاریخی عناصر کو دریافت نہیں کرتی یا شخصیت کے نہاں خانوں میں نہیں جھانکتی وہ تنقید و تحقیق بھی آپ بیتی کی صنف میں اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکتی۔ اور اس نوعیت کی تحقیق محض قاری کے ذہن کو آپ بیتی کی صنف کے حوالے سے متعارف کرنے سے زیادہ اس کے ذہن کو بوجھل بناتی ہے۔ تاہم ڈاکٹر سلمان علی، ڈاکٹر مسرت بانو اور ڈاکٹر سلیم احمد کی آپ بیتیوں کے حوالے سے تحقیق قاری کے لیے آفادی پہلو لے کر ظہور پذیر ہوئی۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ان تینوں محققین کی تحقیق نے آپ بیتیوں کو نمبر شمار کرنے کی بجائے اس صنف کے سیاسی و سماجی، تہذیبی و ثقافتی، نفسیاتی اور جذباتی نوعیت سے اہمیت اُجاگر کی۔ اُمید ہے آنے والے دور میں اس صنف میں جو مزید تحقیقی کام قاری کے سامنے آئے گا، اس میں بھی قاری محض اس صنف سے متعارف ہی نہیں ہو گا بلکہ اس کی مدد سے زندگی کے نئے پہلوؤں سے بھی شناسا ہو گا۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ محمد صفدر رانا، اردو شعراء واُدباء کی خود نوشتیں (۱۹۹۰ء تک)۔ تحقیق و تنقید کی روشنی میں، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، ملتان: بہاءالدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۳ء، ص ۲۴

۲۔ ایضاً، ص ۲۷۵

۳۔ سلمان علی، اردو کی منتخب خود نوشت سوانح عمریوں کا مطالعہ (خرق عادات واقعات کے خصوصی حوالے سے)، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، پشاور: قرطبہ یونی ورسٹی، ۲۰۰۶ء، ص ۱

۴۔ ایضاً، ص ۲-۳

۵۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، آپ بیتی مشمولہ نقوش آپ بیتی نمبر، مدیر محمد طفیل، ۱۹۶۴ء، ص ۶۱

۳۔ سلمان علی، اردو کی منتخب خود نوشت سوانح عمریوں کا مطالعہ (خرق عادات واقعات کے خصوصی حوالے سے)، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، پشاور: قرطبہ یونی ورسٹی، ۲۰۰۶ء، ص ۵۳

۷۔ اطہر قسیم، اردو ادب کی آپ بیتیاں: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، اسلام آباد: نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، ۲۰۰۷ء، ص ۲۸

۸۔ اطہر قسیم، ڈاکٹر، (انٹرویو بذریعہ فون)، از رحمان سرور (محقق)، بہاولپور، ۲۱ نومبر ۲۰۲۱ء

۹۔ اطہر قسیم، اردو ادب کی آپ بیتیاں: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، اسلام آباد: نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، ۲۰۰۷ء، صiii

۱۰۔ محمد نوشاد عالم، اردو خود نوشت سوانح حیات آزادی کے بعد، دہلی: عریشہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص پاورق۔

۱۱۔ شاہانہ مریم شان، ہندوستان کی یونی ورسٹیوں میں اردو تحقیق، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۲ء، ص ۱۴۲

۱۲۔ محمد نوشاد عالم، ڈاکٹر، ای میل بنام رحمان سرور (محقق)، ۲۰ نومبر ۲۰۲۱ء

۱۳۔ مسرت بانو، ڈاکٹر، پاکستانی ادباء کی آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں تاریخی اور تہذیبی شعور (۱۹۴۷ء تا حال)، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، یونی ورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۱۶ء، ص ۵۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۴

۱۵۔ محمد سلیم، ڈاکٹر، قیام پاکستان کے بعد حکمرانوں اور سیاست دانوں کی منتخب آپ بیتیاں (تحقیق و تنقید)، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، پشاور: قرطبہ یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی حیات آباد، ۲۰۱۷ء ص ۱۴

۱۶۔ شہلا اقبال، حافظہ، اردو میں خواتین کی ادبی خود نوشتیں (۱۹۴۷ تا حال)، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، ملتان: بہاءالدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۱۷ء، ص ۱۴

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۷۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۷۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۷۶

References in Roman Script:

1. Muhammad Safdar Rana, Autobiographies of Urdu poets and writers (up to 1990). In the light of research and criticism, Unpublished Thesis for PhD (Urdu), Multan: Bahauddin Zakaria University, 2003, P. 24
2. Ibid, P. 275
3. Salman Ali, A Study of Selected Urdu Autobiographies (with Special Reference to Kharq Adaat Events), Unpublished Thesis for PhD (Urdu), Peshawar: Qurutbah University, 2006, P. 1
4. Ibid, P. 2-3
5. Syed Abdullah, Dr., Autobiography, included Naqoosh Autobiography number, Editor Muhammad Tufail,1964, P. 61
6. Salman Ali, A Study of Selected Urdu Autobiographies (with Special Reference to Kharq Adaat Events), Unpublished Thesis for PhD (Urdu), Peshawar: Qurutbah University, 2006, P. 53
7. Athar Qasim, Autobiographies of Urdu Literature: A Research and Critical Review, Unpublished Thesis for PhD (Urdu), Islamabad: National University of Modern Languages, 2007, P.28
8. Athar Qasim, Interview through Telephone, From: Rehman Sarwar (Researcher), 22nd November 2021
9. Athar Qasim, Autobiographies of Urdu Literature: A Research and Critical Review, Unpublished Thesis for PhD (Urdu), Islamabad: National University of Modern Languages, 2007, P. iii
10. Muhammad Naushad Alam, Urdu Autobiography After Independence, Delhi: Arisha Publications, 2011, P. Footnote
11. Shahana Marium Shan, Urdu Research in Indian Universities, Dehli: Educational Publishing House,2012, P. 142
12. Muhammad Naushad Alam, Dr., Email to Rehman Sarwar (Researcher), 20th November 2021
13. Musrat Bano, Dr., Historical and Cultural Consciousness in the Poems and Memoirs of Pakistani Writers (1947 to Present), Unpublished Thesis for PhD (Urdu), University of Sargodha, 2016, P. 50

14. Ibid, P. 54
15. Muhammad Salim, Dr., Selected Autobiographies of Rulers and Politicians after the Creation of Pakistan (Research and Criticism), Unpublished Thesis for PhD (Urdu), Peshawar: Qurutbah University of Science and Information Technology, Hayatabad, 2017, P. 14
16. Shehla Iqbal, Literary Autobiographies of Women in Urdu(1947-present), Unpublished Thesis for PhD (Urdu), Multan: Bahauddin Zakaria University,2017, P. 14
17. Ibid, P. 271
18. Ibid, P. 275
19. Ibid, P. 276

Dr. Rehman Sarwar Bajwa received the Ph.D. degree in Urdu and is currently serving at the Department of Urdu, Islamia University of Bahawalpur, Pakistan as a lecturer. He has authored and presented over 05 publications in different journals and conferences. He has a strong interest in the field of Urdu fiction and Urdu research & editing.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 20th Feb, 2024 | Accepted: 16th June, 2024 | Available Online: 30th June, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i01.390

لاطینی امریکی ادیبوں کے نوبیل خطبات میں متبادل شناخت کا کلامیہ

Discourse of Alternative Identity in Nobel Prize Lectures of Latin American Writers

QAMAR ABBAS ALVI
Lecturer Urdu, University of Jhang, Pakistan
(qamaralvi133@yahoo.com)

ABSTRACT The Term 'Latin America' is used to describe the region of America where Romance Languages (Derived from Latin) such as Spanish, Portuguese and French are spoken. This region is renowned for its Diverse Culture, Rich History Stunning Landscapes, Encompassing Tropical Rainforests, Andean Mountains and Caribbean Beaches. Notable writers such as Gabriela Mistral, Miguel Angel Asturias, Pablo Neruda, Gabriel Garcia Marques, Octavio Paz and Mario Vargas Llosa hail from this region and have been awarded the Nobel Prize. These Nobel Laureates often explore issues specific to their home countries or regions including social injustice, Resistance and struggle for social change, National and Personal Identity, Economic Inequality and Human Rights enriching the global discourse with their unique perspective and experience. This article is a Close Reading of These Nobel Laureates speeches.

Keywords Colonialism, Magical Realism, Counter Narratives, Alternative Narrative, Native, Cannon, Oral Tradition, Surrealistic Reality, Historical Fiction.

بیسویں صدی دو بڑی جنگوں کے نتیجے میں نو آبادیات (کولونیل ازم) کے خاتمے، نئی ریاستوں کی تشکیل اور نسبتاً نئے عہد کا آغاز ہے؛ نئے عہد کا آغاز ان معنوں میں کہ تیسری دنیا کی متعدد ریاستوں کو یورپی استعماریت سے نجات ملی اور چند نئی ریاستیں معرض وجود میں آئیں۔ سیاسی و سماجی سطح پر یہ صدی جہاں انارکی اور طاقت کے مراکز میں تبدیلیوں کا اعلامیہ ہے وہیں علم و ادب کے یورپی کینن پر سوالات کو بھی راہ ملی، اسی سے اندازہ لگائیں کہ بیسویں صدی کے نصف اول تک عالمی ادب کی اصطلاح کا مطلب کم و بیش یورپی ادب ہی لیا جاتا تھا جس کی غالب وجہ تیسری دنیا کی عدم نمائندگی یا تیسری دنیا کو یورپی نقطہ نظر سے دیکھنا تھا تاہم نو آبادیات کے خاتمے پر منظر نامہ بہت حد تک بدل گیا۔ نہ صرف عالمی ادب میں تیسری دنیا کے لکھاریوں کو شامل کیا جانے لگا بلکہ ان کی شناخت نے بھی نیا رخ اختیار کیا؛ جن شناختوں پر استعماری طاقتیں انھیں غیر مہذب، ناقص، کمتر اور پسماندہ قرار دیتی تھیں انھی شناختوں پر اصرار کیا جانے لگا لہٰذا افریقہ ہو، لاطینی امریکا، ایشیا یا مشرق وسطیٰ (جو عرف عام میں تیسری دنیا کہلاتے ہیں اور نو آبادیاں رہ چکے ہیں) کا ادب پہلی (سپر پاور) اور دوسری دنیا (صنعتی ریاستوں) کے ادب سے مختلف شعریات کے تحت پڑھے جانے کا تقاضا کرتا ہے۔ جہاں جہاں اس ادب کا مطالعہ یورپی تناظر میں کیا گیا مغالطوں نے جنم لیا، عجب نہیں کہ لاطینی امریکی فکشن کے مطالعے میں یورپی ناقدین کی توجہ طلسمی حقیقت نگاری

This work *is licensed under a* **Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)**

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

کی نشان دہی تک محدود رہتی ہے جب کہ لاطینی امریکا کے مقامی باشندے (ادباء اور ناقدین) اس اصطلاح کے وجود ہی سے منکر ہیں؟ یہ تحریر لاطینی امریکی ادب کو مقامی نقطہ نظر (بالخصوص نوبیل لاریٹس) سے دیکھنے کو محیط ہے جنھوں نہ صرف یورپی کینن کو چیلنج کیا بلکہ اپنے کلچر اور ادب کی نئے سرے سے تشکیل اور تعارف کروایا۔

لاطینی امریکا (یا نئی دنیا) کی اصطلاح جنوبی امریکا کی ان ریاستوں کے مجموعے کے لیے استعمال ہوتی ہے جن میں لاطینی سے ماخوذ زبانیں (ہسپانوی، پرتگیزی اور فرانسیسی) بولی جاتی ہیں، یہ خطہ طویل عرصے تک یورپ (سپین، برطانیہ، پرتگال اور فرانس) کی کالونی رہنے کے سبب اپنی اصلی شناخت سے محروم رہا تاہم بیسویں صدی کے آغاز پر ان ریاستوں میں آزادی کی تحریکوں نے جنم لیا اور ربع سوم کے ختم ہوتے ہوتے تقریباً تمام ریاستیں خود مختار ہو گئیں۔ اب تک لاطینی امریکا سے تعلق رکھنے والے چھ ادباء[1] (تین ناول نگار اور تین شعرا) نوبیل انعام کے حق دار ٹھہرے ہیں جن کے نام گیبریلا مسترال، آستوریاس، پابلو نیرودا، اکتاویو پاز، گابرئیل گارسیا مارکیز اور ماریو برگس یوسا ہیں جنھوں نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف مزاحمت، سماجی تبدیلی کے تسلسل، تحفظِ حقوقِ انسانی، معاشی استحصال سے نجات، انفرادی و قومی شناخت اور تشکیلِ نو کو اپنی شاعری اور فکشن کا موضوع بنایا۔ لاطینی امریکی نوبیل لاریٹس کے خیالات کے تجزیے سے قبل واضح کرتے چلیں نوآبادیاتی عہد کا ادب دو طرح کے بیانیوں: مزاحمتی اور متبادل، کو محیط ہوتا ہے۔ مزاحمتی، جوابی یا Counter Narrative نوآبادکار کے بیانیے کے جواب یا رد ہر دو صورتوں میں نوآبادکار کے بیانیے پر منحصر ہوتا ہے جب کہ متبادل یا Alternative Narrative خاصی حد تک آزاد اور مقامیت سے تعلق رکھتا ہے جس میں روایت کی بازیافت کے ذریعے اپنی اصل شناخت کی تشکیلِ نو بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے لاطینی امریکی ادیبوں کے ہاں دونوں طرح کے بیانیے موجود ہیں۔

میگیل اینجل آستوریاس نے نوبیل پرائز وصول کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا:

> "لاطینی امریکی ناول، یعنی ہمارا ناول، اس عظیم جذبے سے غداری نہیں کر سکتا جس نے ہمارے سارے عظیم ادب کی تشکیل کی ہے اور مسلسل کر رہا ہے۔ اگر آپ ناول صرف قاری کی تفریح کے لیے لکھتے ہیں تو ان کو جلا دیجیے۔ میرا یہ پیغام مسیحی مبلغین کی گرم جوشی جیسا ہی ہو گا اس لیے کہ اگر آپ ان ناولوں کو جلا نہیں دیتے تب بھی وہ لوگوں کی یادداشت کے صفحات سے، جہاں ایک شاعر یا ناول نگار رہنے کی تمنا کرتا ہے، بہ ہر حال مٹ جائیں گے۔ ذرا غور کیجیے، آج تک بھلا کتنے لکھنے والے ہوئے ہیں جنھوں نے ناول لکھے ہوں گے صرف تفریح کے لیے؟ اس کے برعکس، ہمارے لیے کتنا آسان ہے ان لوگوں کے نام دہرانا جنھوں نے لکھا ہے تصدیق کے لیے، وقت کی گواہی کے لیے۔"[2]

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

اور کہنا یہ چاہا ہے کہ لاطینی امریکی ناول قاری کی تفریح طبع کے لیے لکھا گیا ادب ہر گز نہیں جیسا کہ یورپی ناقدین اس میں فینٹسی اور طلسمی حقیقت نگاری کی نشان دہی کرتے ہوئے باور کراتے ہیں بلکہ یہ ہر لحاظ سے اپنی زمین سے وفادار ہے۔ یہ اپنے باسیوں کے نظریات، اعتقادات، افکار اور مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے اپنے عہد کی گواہی دیتا ہے اور جو فن پارہ اپنے عہد کی گواہی نہیں دیتا وہ بہت جلد اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔ اس بیان سے آستوریاس کی مراد واقعات کا صحافیانہ بیان ہر گز نہیں بلکہ ادب کی تشکیل میں سماجی و ثقافتی عوامل کی کار فرمائی اور سماجی تبدیلی میں ادیب کے کردار کی نشان دہی ہے۔ سبب یہ ہے کہ لاطینی امریکی ادبا جب اپنے خطے اور عہد کے مسائل کو فن پاروں کا موضوع بناتے ہیں تو ان کا یہ بیان یورپی قارئین و ناقدین کو طلسمی و فنتاسی نظر آتا ہے جب کہ مقامیوں کے لیے عین حقیقت ہے۔ آستوریاس اس غلط فہمی کا ازالہ مقامی ادب کی ہزار سالہ تاریخ کے مطالعے میں تلاش کرتے ہیں، جس کی آبیاری تین تہذیبوں: مایا(Maya) ایزٹیک(Aztec) اور اِنکا(Inca) نے کی جنھیں سمجھے بنا لاطینی امریکا کے مسائل اور ادب کو کماحقہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

آستوریاس کا اصرار ہے کہ ہماری یعنی لاطینی امریکا کی تاریخ اتنی ہی عجیب ہے جتنا کہ کوئی ناول ہو سکتا ہے بہ الفاظ دگر ہماری تاریخ میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جن پر فکشن انحصار کرتا ہے، اور ہماری تاریخ کے ان فکشنی عناصر کو سمجھے بنا ہمارے ناولوں کی تفہیم ممکن نہیں یہی سبب ہے کہ یورپی ناقدین ان کی درست تفہیم سے قاصر ہیں۔ آستوریاس لاطینی امریکی فکشن کو دو ادوار: زبانی روایت (Oral Tradition) اور تحریری روایت (Written Tradition) میں تقسیم کرتے ہیں۔ زبانی روایت مایا اور ایزٹیک کی تمثیلی و مجازی مصوری پر مبنی ان تاریخی کتب سے متعلق ہے جسے مقامی لوگ گا کر سنایا کرتے تھے (وہ پڑھنے اور گانے میں فرق نہیں کرتے تھے)، پڑھنے والا ان قصوں کی تصویری علامات کی زبان کو سمجھتا اور سننے والوں کی تفریح طبع کے لیے ان کی ترجمانی کرتا تھا۔ آگے چل کر یہ تصویروں سے بنی کہانیاں لوگوں کی یادداشت میں جگہ پاتی، نسل در نسل منتقل ہوتی اور اجتماعی لاشعور کا حصہ بنتی گئیں تا آں کہ ہسپانویوں (نو آبادکار) کی آمد کے ساتھ لاطینی اور ہسپانوی زبان میں تحریری روپ دھارنے لگیں۔ یہ ایک نوع کی تاریخی کتب تاریخ سے زیادہ فکشن کی خصوصیات کی حامل ہیں جن کے سبب آستوریاس انھیں فکشن میں شمار کرتا ہے۔ تاریخ اور فکشن کا یہ آمیزہ نہ تو ٹھوس تاریخی حقائق ہیں نہ ہی خالص فکشن بلکہ اسے درست طور پر تاریخی فکشن(Historical Fiction) کہنا چاہیے یہ ایک Surrealistic Reality ہے جو اتنی ہی حیران کن ہے جتنا کہ ایک ناول ہو سکتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ متن کی زبانی روایت میں زمان و مکان کے مسلسل عملِ تنسیخ کے نتیجے میں حقیقت سے کہیں زیادہ فوق الفطرت یا ارفع حقیقت وجود پاتی ہے اور بیان کے متوازی اسالیب جنم لیتے ہیں۔ ایک ہی شے، ایک ہی قسم کے خیالات، ایک ہی کیفیت کے محسوسات کے بیان میں الفاظ کا مختلف مگر متوازی استعمال ہوتا ہے اور مقامی متون کی متوازیت ان درجہ بندیوں کو اجازت فراہم کرتی ہے جو قاری کو ایسی وادیوں میں لے جاتی ہے جسے اعجاز یا جادو کہا جاتا ہے لاطینی امریکی فکشن کے ذیل میں بھی یہی کچھ ہوا۔ لاطینی امریکی فکشن کی زبانی روایت کو آستوریاس کو لمبیاوں سے پہلے کی نسلوں کی بہادری کے گیتوں اور غلامی و محرمیوں کی دستاویزات سے تعبیر کرتے ہیں۔ پہلا حصہ ان گیتوں اور رزمیوں کو محیط ہے جنھیں رجز خواں تاریخی افسانہ طرازی سے بڑھا چڑھا کر قبائل کی عمدہ آوازوں میں شہر شہر

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

گاتے پھرتے تھے تاکہ ان کے گانے کا سحر اور ان کے معبودوں کے لہو کی مثال پھیل سکے۔ مقامی ادب میں ایسے متعدد مگر کم معروف گیت موجود ہیں جو اپنے عہد کے سورماؤں کی یاد دلاتے ہیں جنھیں لوگ سنتے اور پسند کرتے ہیں البتہ دوسری نوع کی دستاویزات کی نوعیت ان سے مختلف ہے۔ یہ دستاویزات عہد غلامی کا احاطہ کرتی ہوئی اپنے عہد کی لاحاصل خاموشیوں کے خلا کو پر کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

لاطینی امریکی ادب کی دوسری یعنی تحریری روایت کا تعلق اِنکا تہذیب سے ہے جو ہسپانویوں کی آمد اور مقامی روایت کے ساتھ آمیزش سے وجود میں آئی۔ اس نوع کی دستاویزات کی مثال Bernal Diaz del Castillo کی تحریر True Story of the Events of the Conquest of New Spain ہے جو ایک وقائع نگار کے ہاتھوں لکھے تاریخی فکشن کی عمدہ مثال ہے۔ Bernal گوئٹے مالا کے شہر سنتیاگو (Santiago) سے تعلق رکھنے والا ایک ہسپانوی النسل سپاہی ہے جس نے اسی برس کی عمر لاطینی امریکا میں گزاری، اس دوران میں اس نے مقامی ادبی متون سنے اور پڑھے اور ان کے انجذاب سے اس کی صورت پذیری کی۔ Bernal اس تحریر میں مقامی لوگوں کو شکست خوردہ، مفتوح ہو کر پاتال میں گرتے ہوئے سراپا احتجاج اور انصاف طلب کرتے دکھاتا ہے، جو وینزویلا کے ادیب Arturo Uslar Pietri کے الفاظ میں 'جدوجہد کی دستاویز'[۳] ہے۔ یہ تحریر اپنی جگہ تلخ اور سفاک سہی مگر اپنے عہد کی گواہ اور بریت کے مماثل ہے اور یہ کسی مؤرخ کا ٹھوس حقائق پر مبنی مسودہ نہیں ایک ادیب کی تحریر ہے جو قاری کو متاثر اور قائل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

لاطینی امریکی ادب کی تحریری روایت نے ایک ایسی نسل کو فروغ دیا جو ہسپانویوں اور مقامی لوگوں کے انجذاب سے وجود میں آئی اس نسل نے لاطینی امریکا کی کماحقہ عکاسی کرتے ہوئے تین موضوعات : جلاوطنی، بغاوت اور رومانیت، کا احاطہ کیا۔ اس دوغلی (Hybrid) نسل کا پہلا نمائندہ Garcilaso ہے جو ہسپانوی النسل امریکی ہے جس نے دونوں روایتوں (ہسپانوی و امریکی) سے استفادہ کرتے ہوئے پیرو (Pero) کے جابر حکمرانوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اول اول تو اس کی تحریروں کا ابلاغ بہت محدود رہا البتہ آزادی کی جدوجہد کے دوران ان کی معنویت عیاں ہونے لگی۔ Garcilaso کی تنقید نے دودھاری تلوار کا کام کیا اس نے جہاں حاکم طبقہ کو نشانہ بنایا وہیں تہذیبی و مذہبی پابندیاں بھی اس کا ہدف ٹھہریں یہاں تک کہ انھیں ضبط کرنے کا حکم جاری ہو گیا۔ گوئٹے مالا کے شاعر Rafael Landivar نے بغاوت کا منفرد انداز اپنایا، طاقت اور طاقت ور طبقے کو نشانہ بنانے کے بجائے ان تصورات کی تنسیخ کی جو مقامی لوگوں سے متعلق عام تھے یہی وجہ ہے کہ اسے دھرتی اور دھرتی کے باسیوں کی معتبر ترین آواز سمجھا جاتا ہے۔ Landivar کے گیت جہاں اپنے خطے کے لہلہاتے کھیتوں، مویشیوں کے گلے، گنگناتے پرندوں اور ذرخیز میدانوں کے بیان اور علاقائیت سے محبت کا ثبوت ہیں وہیں مقامی لوگوں (ریڈ انڈین) کی مبینہ کاہلی اور بدقماشی پر مشتمل یورپیوں کے پھیلائے ہوئے فسانوں کی بھی نفی کرتے ہیں۔ Landivar مقامی لوگوں کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں جس میں وہ باربرداری کرتے، ریشم کے کیڑوں کی کاشت سے ریشم پیدا کرتے، خوبصورت سیپیوں کو کھولنے کے لیے چٹانوں پر جھوجھتے، صبر اور مستقل مزاجی سے ہل چلاتے، نیل کے پودوں کی کاشت کرتے اور کانوں سے چاندی نکالتے نظر آتے ہیں۔ Landivar کا یہ طرز عمل متبادل بیانیے کی عمدہ مثال ہے جس میں طاقت کے مراکز کو نشانہ بنانے کے بجائے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

مقامیت اور مقامیوں کی تعبیرِ نو کرتے ہوئے نو آبادکار کی دی ہوئی شناختوں کو رد کرتے ہیں (اردو کی حد تک ایسا ہی طرزِ عمل انتظار حسین اور میرا جی نے اپنایا)۔

غور کیا جائے تو لاطینی امریکیوں کی رومانیت کسی دبستان سے زیادہ ایک پرچم کی طرح ہے جس کے سائے میں شاعر ناول نگار اور تاریخ نویس اپنے شب و روز کے سیاسی اعمال اور اپنے خواب دیکھتے ہیں۔ آستوریاس لکھتے ہیں: میرے لیے اصل امریکی ناول ان تمام مسائل کے لیے ایک پکار ہے، ایک چیخ ہے جو صدیوں گونجتی رہتی ہے اور پھر کہیں جا کر ہزاروں صفحات میں ابھرتی ہے۔ وہ ناول جو اصلاً ہمارا ہے، اپنے صفحات میں وفادار ہے انسانی جذبوں کا، محنت کشوں کی خالی مٹھیوں کا، کسانوں کے پسینے کا، ہمارے بھوک سے مرجھائے ہوئے بچوں کا اور سمندر کی جانب بہتی ہوئی ہماری وسیع زمینوں کے خون اور عرق حیات کا، جو ہمارے نئے شہروں کو نمو کے شگوفوں کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ ہماری کتابیں علم کی جمہوریہ میں اپنی جگہ بنانے کے لیے سنسنی خیز لوگوں یا دہشت انگیز اثرات کی تلاش میں نہیں رہتیں۔ ہم ان سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں لاطینی امریکی لوگوں سے خونی رشتوں کے ذریعے جڑے ہوئے ہیں جو ہمارے ثروت مند امریکی براعظم میں رہتے ہوئے بھی بدحالی کا شکار ہیں۔ ہمارے ناول تمام دنیا کی اخلاقی قوتوں کا یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان لوگوں کا دفاع کیا جا سکے۔ ہمارے ادب میں دونسلے پن کا عمل بہت آگے جا چکا تھا اور امریکا کی دوبارہ دریافت کے سلسلے میں اس نے براعظم کی پر شکوہ فطرت کو انسانیت کی وسعت بہم پہنچائی۔ مگر یہ فطرت انڈین لوگوں کی کتابوں کے مطابق نہ تو معبودوں کے لیے ہے، نہ ہی رومانیت کی کتابوں کے مطابق سربرآوردہ لوگوں کے لیے ہے، بلکہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ایک ہی جیسی فطرت ہے۔[۴]

آستوریاس کی اس بات سے اختلاف نہیں کہ لاطینی امریکی ناول اپنا پر میتھیئس خود تخلیق کرتا ہے یہ ایک چیخ ہیں ایسے خطے کے مقامیوں کی جو نو آبادیات کا تلخ تجربہ رکھتے ہیں، اپنی مرتی ہوئی تہذیب اور مٹتی ہوئی تاریخ کے نوحہ خواں اور حیاتِ نَو کے لیے کوشاں ہیں، جنھیں اپنی شناخت کا احساس، آزادی کے مفہوم اور قیمت کا اندازہ ہے اور اس اعتماد سے لکھتے ہیں بھلے ان کا ادب کسی قوم کے لیے موضوع کی حد تک کتنا ہی عجیب اور پر اسرار ہو اپنے خطے اور لوگوں کا وفادار ہے۔ یہ ناول اپنے اسلوب کے اعتبار سے لکھے ہوئے سے زیادہ بولے ہوئے ہیں یعنی ان کا تعلق تحریر کی روایت سے تو ضرور ہے مگر یہ ہماری زبانی روایت سے لاتعلق ہرگز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سارے لوگوں کی ان کی قرات کے دوران کسی متحرک منظر کا سا احساس ہوتا ہے جس کا سبب ان کا ڈرامائی انداز ہونے کے بجائے مقامی کہاوتوں، قصوں، تشبیہات اور تماثیل کا سلسلہ ہے۔ یہ بہ ظاہر تو لکھے ہوئے الفاظ ہیں مگر حقیقتاً یہ حروف سے آواز کے بجائے آواز سے حروف بنانے کا عمل ہیں اسے اصطلاح میں Onomatopoeia کہتے ہیں، جسے سمجھے بنا لاطینی امریکی ناولوں کی تفہیم ممکن نہیں۔

لاطینی امریکا سے تعلق رکھنے والے دوسرے ناول نگار گابریئل گارسیا مارکیز ہیں جنھیں ۱۹۸۲ میں ادب کے نوبیل پرائز سے نوازا گیا۔ مارکیز نے اپنے نوبیل پرائز لیکچر بعنوان: لاطینی امریکا کی تنہائی، کا آغاز فلورنس کے جہاز راں انتونیو پیگافیتا (جو دنیا کے گرد پہلے بحری سفر میں ماگیلان کا ساتھی تھا) کی رودادِ سفر سے کیا جو حقیقت پر مبنی ہوتے ہوئے بھی ایک طلسم ہے ملاحظہ فرمائیں:

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

"وہ[انتونیو پیگافیتا]بتاتا ہے اس نے ایسے سور دیکھے جن کی ناف ان کے پٹھوں پر تھی، ایسے پرندے دیکھے جن کی ٹانگیں غائب تھیں اور جن کی مادائیں نروں کی پیٹھ پر انڈے دیتی تھیں، بعض پرندے پیلکن سے مشابہ تھے مگر ان کی زبانیں نہیں تھیں اور چونچ کی شکل چمچے کی طرح تھی۔ وہ ایک ایسی مخلوق کو دیکھنے کا تذکرہ کرتا ہے جو خچر کے سر اور کان، اونٹ کا دھڑ، ہرن کی ٹانگیں اور گھوڑے کی ہنہناہٹ لے کر پیدا ہوئی تھی۔ وہ بتاتا ہے کہ کس طرح پاتاگونیا میں پہلی بار کسی مقامی سے سامنا ہونے پر، انھوں نے آئینہ اس کے مقابل کر دیا تھا، جس سے وہ مشتعل دیوزاد، اپنے عکس کی دہشت کے روبرو ہوش وہواس کھو بیٹھا۔"(۵)

انتونیو پیگافیتا کا یہ بیان سفر نامے سے کہیں زیادہ افسانوی تحریر کا اقتباس معلوم ہوتا ہے اور لاطینی امریکا کی بالکل ویسی ہی تصویر پیش کرتا ہے جیسی ایک نو آبادکار کے خیال میں ممکن ہو سکتی ہے یا وہ ایک کالونی کی جیسی تصویر اس کالونی کے باہر کے لوگوں میں پیش کرنا چاہتا ہے ورنہ پرندوں کے پروں کا غائب ہونا یا مادااوں کا نروں کی پیٹھ پر انڈے دینا کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے؟ تاہم مارکیز کا ماننا ہے کہ یہ ہمارے لیے کوئی حیرت کی بات نہیں بلکہ سیاحوں نے ایسے متعدد بیانیے چھوڑے ہیں اور لاطینی امریکا کی حقیقت عرصے تک متعدد نقشہ سازوں اور نقشوں میں ایسے ہی بیان ہوتی رہی ہے ویسے بھی نقشہ سازی، ترجمہ کاری اور سفر نامے کی تخلیق کبھی بھی کلی طور پر معصوم کارروائی نہیں ہو سکتی(۶) لہٰذا ہم لاطینی امریکی اپنے اس امیج سے خوفزدہ ہوتے ہیں نہ برہم بلکہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہماری تاریخ اپنے اندر اتنا ہی طلسم رکھتی ہے، یہاں کچھ بھی ممکن ہے۔ نو آبادکار (ہسپانویوں) کی آمد کے بعد سے لاطینی امریکا میں اسے متعدد واقعات رونما ہو چکے ہیں جو اس بیان کردہ حقیقت سے کہیں زیادہ پر اسرار، حیران کن، دلخراش اور چشم کشا ہیں یہ وہی زمین ہے جس کے چھوٹے سے ملک ایکواڈور پر سولہ برس تک مطلق العنان حکمرانی کرنے والے جنرل گابریئل گارسیا مورینو کی فوجی وردی میں ملبوس تمغوں سے لدی ہوئی لاش صدارتی کرسی پر متمکن اپنی آخری رسومات میں شرکت کرتی ہے، جنرل ماکسی ملیانو ہرنانڈیز مارتینیز جو اِل سلواڈور کا حکمران رہا اور سولہ ہزار بے گناہ کسانوں کو تہہ تیغ کرنے اور اپنے خلاف ہونے والی بغاوت اور غذا میں زہر کا پتا چلانے کے لیے ایک پنڈولم ایجاد کرتا ہے اور ایک وبا میں مدافعت کی غرض سے گلی کے لیمپوں کو سرخ کاغذ سے ڈھکوا دیتا ہے، اسی زمین پر تگوسی گالپا کے ایک مرکزی چوک میں ایستادہ جنرل فرانسسکو مورازان کا مجسمہ حقیقت میں پیرس کے ایک مجسموں کے گودام سے خرید کر لایا گیا۔

نہ صرف یہ بلکہ اس خطے نے محض گیارہ سال کے عرصے میں پانچ جنگوں، سترہ فوجی بغاوتوں اور ایک ڈکٹیٹر کا سامنا کیا ان جنگوں میں کم و بیش دو لاکھ مرد و زن لقمہ اجل بنے، گرفتار کی جانے والی عورتوں نے جیلوں میں بچوں کو جنم دیا جو معجزانہ طور پر غائب کر دیے گئے یا پھر یتیم خانوں کو سونپ دیے گئے کسی کو معلوم نہیں، صرف وہ بچے ایک سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے موت کا شکار ہوئے ان کی تعداد دو کروڑ ہے یہ تعداد اس عرصے میں یورپ بھر میں پیدا ہونے والے بچوں کی کل تعداد سے زیادہ ہے مزید براں جبری گمشدگی کا شکار ہونے والوں کی تعداد بھی ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ ہے یہ سب اس لیے ہوا کہ اس خطے کے باسی اپنی دنیا کو بغیر کسی تبدیلی کے جاری رہتا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان مارے جانے والوں کے علاوہ جلاوطنی اختیار کرنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے صرف چِلی سے دس

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

لاکھ افراد نے ترک وطن کیا جو اس کی کل آبادی کے دسویں حصے کے برابر ہے، یوراگوائے جو پچیس لاکھ کا ایک چھوٹا سا ملک ہے، کا ہر پانچواں فرد جلاوطنی پر مجبور ہے، اِل سلواڈور کی یہ حالت رہی ہے کہ ہر بیس منٹ پر ایک فرد پناہ گزینی پر مجبور ہو رہا ہے بحیثیتِ مجموعی لاطینی امریکا کے تمام تارکینِ وطن پر مشتمل ایک ملک بنایا جائے تو اس کی آبادی ناروے سے زیادہ ہو گی۔

یہ وہ اعداد و شمار ہیں جن کا بیان لاطینی امریکیوں کے لیے عین حقیقت البتہ لاطینی امریکا سے باہر بسنے والوں کے مبالغہ آمیز، جادوئی یا پتا نہیں کیا ہے۔ یہ حسن اور درد کا خطہ جسے مارکیز نے 'آسیب زدہ مَردوں اور تاریخ ساز عوتوں کی سرزمین'[۷] لکھا ہے اتنا ہی عجیب ہے یہاں کے لکھنے والوں کو موضوعات کی تلاش کے لیے متخیلہ پر انحصار نہیں کرنا پڑتا بلکہ موضوعات ان کی نیندیں اڑا دیتے ہیں ان کے پاس لکھنے کے لیے بے شمار کہانیاں ہیں انھیں صرف انتخاب کی ضرورت ہے کہ پہلے کس دُکھڑے کو رویا جائے اور کسے موقوف رکھا جائے۔ سو انھیں موضوع سے زیادہ اسلوبِ بیان کا انتخاب کرنا پڑتا ہے کہ اپنے دکھ میں دوسروں کو کیسے شریک کیا جا سکے، کس اسلوب میں اپنی اس دہشت ناک صورت حال کو من و عن اپنے قارئین تک منتقل کیا جا سکے۔ مارکیز یورپی ناقدین سے شکوہ کناں ہیں: یہ بات قابلِ فہم ہے کہ دنیا کے اس حصے کی عقلی صلاحیتیں، جو اپنی تہذیب کے انہماک میں سرفراز ہیں، ہماری شرح کرنے کا کوئی موزوں طریقہ نہ پا سکیں۔ یہ محض فطری بات ہو گی کہ وہ (یعنی یورپی) ہمیں جانچنے کے لیے بھی وہی پیمانہ اختیار کریں جو وہ خود اپنے لیے اختیار کرتے ہیں، اس بات کو فراموش کر کے کہ زندگی کی غارت گری سب کے لیے یکساں نہیں ہوتی، اور اس بات کو بھی کہ شناخت کی جستجو ہمارے لیے بھی اتنی ہی دشوار اور خوں آلود ہے، جتنی خود ان کے لیے رہ چکی ہے۔ اجنبی اصطلاحات میں ہماری شرح کرنا ہمیں اور زیادہ نامعلوم، ہماری آزادی کو اور زیادہ محدود اور ہمیں اور زیادہ تنہا کر دیتا ہے۔[۸]

مارکیز کے دونوں شکوے بجا ہیں اول لاطینی امریکیوں کا بھی اتنا ہی حق ہے کہ یورپی ناقدین انھیں اسی کسوٹی پر پرکھیں جس کی وہ اپنے لیے توقع رکھتے ہیں دوم اجنبی اصطلاحات (غالباً طلسمی یا جادوئی حقیقت نگاری) لاطینی امریکا کی شناخت کو اور زیادہ مبہم اور لاطینی امریکیوں کا تنہا کر دیتی ہے۔ مارکیز آگے چل کر کچھ سولات اپنے مخاطبین (و قارئین) کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں کہ جب ہمارے ناولوں کو سراہا جاتا ہے اور ہماری تخلیقی قوتوں کی داد (جس کی ایک کڑی نوبیل پرائز بھی ہے) دی جاتی ہے تو یہ کیوں بھلا دیا جاتا ہے کہ ہم اسی صورتِ حال سے نکلنے کے لیے لکھتے ہیں، اور سماجی تبدیلی کے لیے ہماری جستجو کو کیوں نہیں سراہا جاتا؟ کیا یورپ کے کسی خطے میں سماجی ناانصافی کے خلاف ہونے والی مزاحمت اور ہماری مزاحمت کی منزل ایک نہیں ہے؟ اگر ہم سب کی منزل ایک ہے تو اس کے لیے دو جداگانہ طرزہائے عمل کیوں؟

مارکیز کے یہ سوالات جھنجھوڑ دیتے ہیں، جب کسی خطے کے لکھاریوں کی تخلیقی قوتوں کو سراہا جا رہا ہے تو ان کی سماجی تبدیلی کے لیے کوششوں یا سماج میں موجود مسائل کو طلسمی یا جادوئی کہہ کر ان چشم کشا حقائق پر پردہ پوشی کیوں کی جاتی ہے؟ مارکیز لکھت کو اسی چشم پوشی کے خلاف مزاحمت کے طور پر جاری رکھتے ہیں اور اسے جاری دیکھنا چاہتے ہیں کیوں کہ وہ ولیم فاکنر کے ہم خیال اور 'انسان کے خاتمے کے منکر ہیں'[۹]، وہ اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ انسان کے بقا کو ماننے والے گو تعداد میں زیادہ مگر وسائل سے محروم ہیں ہاں یہ بزدل نہیں؛ ویسے کیا یہ المیہ نہیں کہ انھی ممالک میں شرح پیدائش سب سے زیادہ ہے جو نام نہاد تیسری دنیا کا حصہ اور اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ہیں؟ دوسری طرف پہلی اور دوسری دنیا کے خوشحال ممالک نے تباہی کے لیے اس قدر ہتھیار جمع کر لیے ہیں جو اس سیارہ سے زندگی کے نام ونشان کو کئی بار مٹا دینے کے لیے کافی ہیں؟ مارکیز ہی نہیں زندگی پر یقین رکھنے والا کوئی بھی لکھاری انسانی کے خاتمے کی جنگ کا حصہ نہیں بن سکتا ہندوستان کی روشن خیال ادیبہ اور لکھاری ارندھتی رائے کا دوٹوک موقف ہے: اگر آپ مذہب پر یقین رکھتے ہیں تو یاد رکھیے ایٹم بم انسان کی طرف سے خدا کو دیا جانے والا چیلنج ہے۔ اس چیلنج کے الفاظ بالکل سادہ ہیں: تو نے جو کچھ بنایا ہے اسے ہم تباہ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اگر آپ مذہبی نہیں ہیں تو اس کو یوں دیکھ سکتے ہیں: ہماری دنیا چار ارب ساٹھ کروڑ سال پرانی ہے اور یہ محض ایک سہ پہر میں تباہ کی جاسکتی ہے۔[۱۰] مارکیز لاطینی امریکا کی خانہ جنگی، جبری گمشدگی، لوٹ مار اور جلاوطنی کے مقابل زندگی کو رکھتے ہیں اور مانتے ہیں کہ ہم لکھاری اس دنیا کو بدلنے پر قدرت نہیں رکھتے مگر ہم تبدیلی کا خواب تو دیکھ سکتے ہیں۔ ہم کہانیاں ایجاد کرنے والوں کے لیے کہانی لکھنا خواب دیکھنا ہے اس دنیا کا خواب جس میں زندگی آسان اور زندگی پر یقین پختہ ہو۔

مارکیز کی اس مزاحمت کو آگے بڑھانے والے اور لکھت کو ناخوشی سے مقابلے کا ذریعہ[۱۱] بنانے کے مدعی ناول نگار اور نقاد ماریو برگس یوسا نے اپنی نوبیل پرائز تقریر میں سوال اٹھایا کہ کیا میرے جیسے تیسری دنیا کے ممالک کے باسیوں: جن کے قارئین معدودے چند، آبادی کی اکثریت غریب اور ان پڑھ اور ثقافت محض چند گھروں کی خصوصی مراعات میں شامل ہے، کے لیے لکھنا اَنا پرستانہ تعیش نہیں؟[۱۲] سوال پیدا ہوتا ہے میرے ایسے لکھاری جن کے قارئین نہ ہونے کے برابر ہیں، جنھیں جینے اور لکھت کو جاری رکھنے کے لیے مطلوبہ سہولیات خود سے ایجاد کرنا پڑتی ہیں یا ان کے بغیر جینا پڑتا ہے آخر لکھتے ہی کیوں ہیں؟ کیا لکھنا ان کے لیے منافع بخش پیشہ ہے یا کوئی ذاتی مجبوری؟ (برسبیلِ تذکرہ یوسا سے قبل یہ سوال عربی ناول نگار نجیب محفوظ بھی اپنی نوبیل تقریر میں اٹھا چکے ہیں تاہم) یوسا کھل کر اعتراف کرتے ہیں کہ لکھنا میرے نزدیک اَنا پرستانہ تعیش یا مزاحمت اور لکھت ناخوشی سے مقابلے کا ذریعہ ہے یعنی وہ سب کچھ جو میسر نہیں یا جس کا حصول ناممکن ہے اسے اپنی لکھت کی دنیا میں ممکن بنانا، دوسرے الفاظ میں تحریر کے ذریعے ایک متوازی زندگی خلق کرنا جو حقیقی دنیا سے زیادہ منظم، خوبصورت اور دل کش ہو۔ ہم فکشن اس لیے ایجاد کرتے ہیں کہ صرف ایک زندگی دسترس میں ہوتے ہوئے کسی نہ کسی طرح متعدد زندگیاں گزار سکیں۔[۱۳] یہ تحریر کی دنیا ہی ہے جو غیر معمولی کو فطری اور فطری کو غیر معمولی بنا سکتی ہے، جو انتشار کو رد کرنے، بدصورتی کو حسن دینے اور موت کے خوف کو دھندلا سکتی ہے۔ گو فکشن یا ادب زندگی کی ایک مصنوعی شبیہ ہے پھر بھی یہ ہمیں زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل بناتا ہے، حقیقی زندگی کی دی ہوئی مایوسیوں کا ازالہ کرتا اور زندگی کا شعور دیتا ہے۔ اور اگر ادب کو اپنی زندگی سے خارج کر کے دیکھیں تو یک رنگی کے علاوہ کچھ نہیں بچے گا جہاں ادب اپنے قاری کو لطف، حیرت یا تکلیف ایسے احساسات میں مبتلا کرتا ہے وہیں زندگی کی اہمیت بھی اجاگر کرتے ہوئے جبر کے خلاف مزاحمت اور آزادی کا احساس بھی دلاتا ہے کہ یہی زندگی جب کسی آمر یا مذہب کے پیروکاروں کا شکار ہوتی ہے تو کیسے جہنم بن جاتی ہے؟ ادب کی اسی تاثیر کا سبب ہے کہ ہر دور کی حکومتیں اس سے خائف رہی ہیں ورنہ لوگوں کے گود سے گور تک کے معمولاتِ زندگی کو کنٹرول کرنے والی حکومتوں کو سنسر شپ کی ضرورت کیوں کر پیش آتی ہے؟ ادب اور بالخصوص فکشن کی دنیا آمروں اور مذہبی بنیاد پرستوں کے تشکیل کردہ یک رخے اور مطلق العنان سچائی کے تصور کا ملیامیٹ کر دیتی ہے ادب کسی حتمی سچائی کا دعوے دار نہیں، نہ ہو سکتا ہے، ادب اپنے اندر اتنی وسعت رکھتا ہے کہ حقیقت کے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

متنوع اور متضاد پہلوؤں کو ایک ہی وقت میں تصور میں لا سکتا ہے اور اسے ان میں کوئی تضاد نہیں محسوس کرتا جب کہ مذہب اور آمروں کی دنیا کی ساری طاقت حقیقت کی سادہ، غیر متغیر اور اکہری تعبیر میں ہے۔ ادب انسانی تنوع کے اندر ایک برادری خلق کرتا اور لاعلمی، نظریات، مذاہب، زبانوں یا حماقت کے باعث مرد و خواتین کے درمیان قائم سرحدوں کو غیر اہم بناتا ہے۔ عجب نہیں کہ جب ادب کی آزاد دنیا کا قاری تحریر کی دنیا کی آزادی کا موازنہ حقیقی دنیا سے کرتا ہے تو اسے نہ صرف مایوسی ہوتی ہے بلکہ اجنبیت کا یہی احساس اس کے اندر بغاوت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ کہانیوں کے لکھاری دانستہ یا نادانستہ طور پر جب کہانیاں ایجاد کرتے ہیں تو بے اطمینانی کو جنم دیتے ہیں یہی بے اطمینانی جب شعور میں جگہ بنا لیتی ہے تو قارئین آمروں اور مذہبیوں کی تشفیوں اور داروغوں پر؛ جو انھیں یقین دلاتے ہیں کہ سلاخوں کے پیچھے زندگی محفوظ ہے، یقین نہیں لاتے اور ان پر کنٹرول کرنا آسان نہیں رہتا۔ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے ہر آمر سنسر شپ کا سہارا لیتا ہے عجب نہیں کہ افلاطون اپنی یوٹوپیا[۱۴] کی بقا شعرا (قدیم یونان میں ڈراما منظوم تھا سو شاعری اور ڈراما ایک ہی چیز تھی) کی دربدری میں دیکھتا ہے۔ بقولِ یوسا:

> "ادب کے جھوٹ ہمارے توسط سے صداقتیں بنتے ہیں، فکشن کی وجہ سے خواہشات زدہ قارئین اوسط درجے کی حقیقت پر متواتر سوال اٹھاتے رہتے ہیں۔ جب ادب ہمیں امید دلاتا ہے تو ہم جیسے جادو کے تحت اُس ناممکن وجود تک رفعت پا لیتے ہیں جہاں قدیم دیوتاوں کی طرح بیک وقت فانی اور ابدی دونوں کو محسوس کرتے ہیں جو ہماری روحوں میں ناموافقت پذیری اور بغاوت دونوں کو متعارف کرواتا ہے۔ یہی ناموافقت پذیری اور بغاوت ان تمام سورمائی کارناموں کے پیچھے موجود ہیں جنھوں نے انسانی تعلقات میں تشدد کو گھٹانے میں حصہ ڈالا؛ تشدد کو گھٹایا اس کا خاتمہ نہیں کیا۔ کیوں کہ خوش قسمتی سے ہماری کہانی نامکمل رہے گی اس لیے ہمیں خواب دیکھنا، پڑھنا اور لکھنا جاری رکھنا ہے۔ ہم نے اپنے فانی پن کو کم کرنے، وقت کی زنگار کو شکست دینے اور ناممکن کو ممکن میں بدلنے کا یہی مؤثر ترین طریقہ ڈھونڈا ہے۔"[۱۵]

یوسا برملا اظہار کرتے ہیں کہ ہمارا دور متعصبین اور دہشت گردوں کا ہے، سچائی کے مطلق اور اکہرے تصور پر یقین رکھنے والے بنیاد پرستوں کا، یہ گروہ قتل و غارت کے ذریعے اپنے عقیدے کو منوانا اور جنت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف آمریت اور بادشاہتوں کے انہدام پر ہمیں امید تھی امن، شانتی، تکثیریت اور انسانی حقوق رفعت پائیں گے مگر ایسا نہیں ہو سکا دنیا خطرناک جنگوں، نسل کشی اور ہولوکاسٹ کی طرف بڑھ گئی اور استحصال و بربریت کی نئی شکلوں نے جنم لیا، نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اس قدر نیوکلیئر ہتھیار جمع کر لیے ہیں کہ کسی دن جنونیوں کا چھوٹا سا گروہ دنیا کے خاتمے کی جنگ چھیڑ سکتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ ختم ہو سکتا ہے۔ ایسے حالات میں ہمیں ان کا مقابلہ کرنا ہو گا، انھیں روکنا ہو گا جو تہذیب کے صدیوں پر محیط تسلسل کے نتیجے میں حاصل ہونے والی ہماری آزادی ہم سے چھیننا چاہتے ہیں۔ سیاسی تکثیریت، بقائے باہمی، بردباری، انسانی حقوق، اختلاف رائے اور تنقید کا احترام، قانون کی بالادستی اور آزادانہ انتخابات ہمیں وحشی زندگی سے نکال کر ادب کی وضع کردہ خوبصورت زندگی کے قریب تر لانے والی ہر چیز جسے آپ صرف

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ایجاد کرنے اور لکھت کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں، کے لیے ہمیں لبرل جمہوریت کا دفاع کرنا ہو گا۔ یوسا دنیا میں کسی بھی نوع کی آمریت وہ چِلی کے جنرل پنوشے، کیوبا کے فیڈرل کاسترو، افغانستان میں طالبان، ایران میں اِماموں، جنوبی افریقہ میں نسل پرستوں یا برما میں یونیفارم والوں کی ہو، کو ناقابلِ قبول گردانتے ہیں، وہ اپنا موقف کھل کر بیان کرتے ہیں:

> "میں قوم پرستی کی ہر صورت، علاقائی تعصب پر مبنی آئیڈیالوجی، بلکہ کسی بھی ایسے مذہب سے نفرت کرتا ہوں جو کوتاہ نظر، صرف مخصوص طبقے کے لیے ہے اور عقلی افق کو تقسیم کرتا ہے اور اپنے سینے میں لسانی و نسلی تعصبات چھپائے ہوئے ہے، کیوں کہ یہ آپ کے وطن کے حالات کو ایک مطلق قدر، ایک اخلاقیاتی و وجودیاتی مراعات میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مذہب کے علاوہ قوم پرستی بھی تاریخ میں بہت زیادہ قتلِ عام کا سبب بنی ہے، مثلاً دو عالمی جنگیں اور مشرقِ وسطیٰ میں اس وقت جاری خون ریزی۔ لاطینی امریکا کو بے حس لڑائیوں اور تنازعات کے ذریعے خون میں نہلانے میں قوم پرستی نے بہت حصہ ڈالا؛ اس کی وجہ سے فلکیاتی تحقیق کے لیے مختص کردہ وسائل کو سکول، کتب خانے اور ہسپتال بنانے کے بجائے ہتھیاروں کی فروخت پر لٹایا گیا۔"(۱۶)

یوسا آمریت اور نسل پرستی یا آئیڈیالوجی کے لیے کوئی لچک نہیں رکھتے وہ انسانیت کو ایک اکائی میں دیکھتے ہیں جو زبانوں، عقائد، تعصبات، رسوم ورواج اور صنفی تقسیم سے بالاتر محض انسانی قدر ہے۔ موبی ڈک کی سفید وہیل جب کرنل اہب کو سمندر میں دفن کر دیتی ہے، ایما بواری آرسینک کھاتی ہے یا جب ہمیں معلوم پڑتا ہے پیڈرو پرامو گاوں کے سب رہائشی مر چکے ہیں تو ایک خدا پر یقین رکھنے والے، متعدد خداوں کو ماننے والے یا ملحدین ایک ہی نوع کی جھرجھری اپنے بدن میں محسوس کرتے ہیں جو نظریات، عقائد اور صنفی تقسیم سے بالاتر حقیقت ہے۔

یوسا کی شناخت لاطینی امریکی مصنف کی ہے تاہم وہ خود کو بیک وقت قبل از ہسپانوی یعنی ریڈ انڈین اور ہسپانوی ثقافت کا وارث سمجھتے ہیں انھیں پیروئی ہونے اور ہسپانوی پاسپورٹ رکھنے میں کسی عدم مطابقت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ سپین اور پیرو کو ایک ہی سکے کے دو رخ تصور کرتے ہیں جن کی تاریخ، زبان اور ثقافت سب مشترک ہیں۔ لاطینی امریکی لکھاریوں کا یہ امتیاز ہے کہ انھوں نے اپنی ثقافت کو نظر انداز نہیں کیا وہ نو آبادکار سے پہلے اور بعد کی دونوں روایتوں کے امین ہیں، وہ تحریر کی دنیا کے نمائندے ہوتے ہوئے اپنے خطے کی زبانی روایت سے رشتہ قائم رکھتے ہیں۔ یوسا کے نزدیک پیرو اور سپین کی شناختوں میں کوئی تضاد نہیں وہ جہاں اِنکاوں کی وراثت کو قبول کرتے ہیں وہیں امریکا کی پر تشدد تسخیر کرنے والے ہسپانویوں کو بھی اپنے اباواجداد قبول کرتے ہیں۔ وہ لاطینی امریکی ہیں، ہسپانوی زبان میں لکھتے ہیں اسی زبان نے انھیں عالم گیر شہرت دی اسی نے انھیں موقع دیا کہ وہ سٹاک ہولم میں اپنی بات اتنے اہلِ علم کے سامنے رکھ سکیں۔ ۱۹۹۰ میں ایسے ہی ایک اور موقعے پر نوبیل انعام وصول کرتے ہوئے لاطینی امریکی شاعر نے کہا:

> "میرے کلاسیک وہ ہیں جو میری زبان سے تعلق رکھتے ہیں اور میں کسی ہسپانوی ادیب کی طرح خود کو Lope اور Quevedo کا وارث سمجھتا ہوں، اس کے باوجود کہ میں ہسپانوی نہیں ہوں۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

> میری خیال ہے کہ ہسپانوی [لاطینی] امریکا کے زیادہ تر ادیب، اور اسی طرح ریاست ہائے متحدہ امریکا، برازیل اور کناڈا کے تمام ادیب، انگریزی، پرتگالی اور فرانسیسی روایات کے بارے میں بھی یہی کہیں گے۔ امریکاؤں کے ادیبوں کی حیثیت کو زیادہ واضح طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں مکالمے کی اس مثلث کو مدِ نظر رکھنا چاہیے جو جاپانی، چینی اور عرب ادیبوں نے یورپ کے مختلف ادب سے قائم کیے ہیں۔ یہ وہ مکالمہ ہے جو کثیر العناصر زبانوں اور تہذیبوں سے براہِ راست قائم ہے۔ اس کے برعکس ہمارا مکالمہ اس زبان کے اندر ہی ہوتا رہتا ہے۔ ہم یورپی ہوتے ہوئے بھی یورپی نہیں۔ تو پھر ہم ہیں کیا؟ ہماری تعریف کہ ہم کیا ہیں ایک مشکل کام ہے، مگر ہمارا کام ہمارے بارے میں خود بولتا ہے۔"(۱۷)

یہ اقتباس اوکتاویو پاز کی نوبیل پرائز تقریر بعنون 'موجود کی تلاش میں' سے لیا گیا ہے جس میں لاطینی امریکی ادیبوں اور بطور خاص خود کو ہسپانوی نہ ہوتے ہوئے بھی ہسپانوی ادب کا وارث اور یورپی ہوتے ہوئے بھی خود کو یورپی نہیں تسلیم کیا۔ بالخصوص پاز کی ذاتی اور بالعموم تمام لاطینی امریکی ادیبوں کی اجتماعی شناخت کیا ہے؟ جہاں تک اکتاویو پاز کا تعلق ہے اس نے ہسپانوی نژاد ماں اور ہند ہسپانوی باپ سے جنم لیا اور ہسپانوی زبان میں لکھا مگر اس کی شناخت کیا ہے؟ ہندی، امریکی یا ایک دوغلی نسل؟ یہ سوال محض اوکتاویو پاز تک محدود نہیں ان تمام ادیبوں اور ان کی تحریروں کو درپیش ہے جن کے اباواجداد امریکی اور ہسپانویوں کا آمیزہ ہیں۔ اوکتاویو پاز کا خود کو ہسپانوی سرمائے کا وارث قرار دینے میں کوئی مبالغہ نہیں ان کی پہچان ہسپانوی زبان کے مابعد نو آبادیاتی ادیب ہی کی ہے اور ہسپانوی زبان اپنے اندر یورپی و امریکی ہر دو شناختوں کا حسین امتزاج رکھتی ہے۔ کوئی بھی زبان اس خطے کے صدیوں کے تال میل سے جنم لیتی اور پنپتی ہے لاطینی امریکی زبانیں (ہسپانوی، پرتگیزی یا فرانسیسی) یورپیوں اور مقامی لوگوں کے اتصال کا نتیجہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ زبانیں یورپ کی سرزمین سے لاکر لاطینی امریکا میں پیوند کی گئی جس کے باعث لاطینی امریکی ادب پیوندکاری کا نتیجہ ہے یعنی جتنا یورپی ہے اتنا ہی امریکی ہے یا دونوں کا دل کش امتزاج ہے۔ مگر اس ادب کا امتیاز یہ ہے کہ یہ یورپ کا پرتو یا نقالی نہیں اس سے مختلف، منفرد اور یورپی کینن کی نفی کرتا ہے، جس کی نمائندگی اوکتاویو پاز اور دیگر لاطینی امریکی ادباء کرتے ہیں۔

لاطینی امریکا اور اس کا ادب یورپی (ہسپانوی، پرتگیزی اور فرانسیسی) اور مقامی تہذیبوں (مایا، اِنکا اور ایزٹیک) کی آمیزش کا نتیجہ ہے جس کی تہہ میں نو آبادکار کی آمد سے قبل کی اسطور، زبان، رواج اور فن پارے موجود ہی نہیں سانس لیتے اور اپنی موجودگی کا اظہار کرتے ہیں جو اس خطے کی روایت کو یورپی روایت سے جوڑتے بھی ہیں اور علاحدگی بھی اختیار کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے جو خطے نو آبادیاتی تجربے سے گزرے ہیں ان کی تاریخ، زبانیں، کلچر اور ادب جہاں نو آبادکار کی تہذیب سے اثر قبول کرتے ہیں وہیں اپنی شناخت پر اصرار بھی کرتے ہیں۔ اوکتاویو پاز یورپی تہذیب سے علاحدہ شناخت کو کسی تھیوری کے بجائے ذاتی تجربے اور واردات سے واضح کرتے ہیں یعنی بطور شاعر ان کے لیے یہ تجربہ کیسا رہا؟

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

پاز اپنے بچپن کے ایک واقعے[۱۸] کی یادداشت (یادداشت کسی تجربے یا واقعے کی بازیافت کم اور تشکیلِ نو زیادہ کرتی ہے) سے اس تجربے کی وضاحت کرتے ہیں کہ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ بہت چھوٹے تھے اور اپنے خاندان کے ہمراہ میکسیکو سٹی کے مضافات میں آبائی گھر میں رہائش پذیر تھے جس میں ایک باغیچے اور کتابوں سے بھرے ہوئے کمرے کے علاوہ کچھ خاص نہیں تھا۔ جہاں پاز اپنے عم زادوں کے ہمراہ انجیر، صنوبر اور دیودار کے درختوں میں کھیل کود میں وقت بتاتے یا کبھی کبھار کچھ پڑھنے کی کوشش کرتے۔ مگر اس دور نے انھیں فوری طرح اپنے طلسم میں لے رکھا تھا، کہیں سرسبز درخت تو کہیں سمندر کا نظارہ الغرض وہ اس دنیا کو خیر باد نہیں کہنا چاہتے تھے مگر یہ طلسم آخر کار ایک دن ٹوٹ گیا، ہوا یوں کہ ایک دن ان کی عم زاد جو عمر میں ان سے شاید کچھ زیادہ تھی نے انھیں شمالی امریکا کے کسی رسالے کا نسخہ تھمایا جس میں کسی لمبی چوڑی سڑک پر فوجیوں کی پریڈ کی تصویر شائع کی گئی تھی جو شاید کسی جنگ سے واپس آرہے تھے۔ اس معمولی سے واقعے نے پاز کی زندگی کا رخ بدل دیا ایک لمحے کو پاز کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے حال کے لمحے سے نکال کر کسی اور ہی دنیا میں دھکیل دیا ہو، وہ دنیا تاریخ اور استعمار کی تاریخ کی دنیا ہے، اپنے استحصال اور محرومی کی دنیا ہے، جس کے رد عمل میں انھوں نے اپنی ساری توجہ لمحہء موجود کی تلاش میں لگا دی، وہ لکھتے ہیں:

> "حال کی تلاش نہ تو کسی زمینی جنت کا تعاقب ہے نہ کسی ابدی دوام کی—یہ تلاش ہے اپنی اصل کی ۔ ہم ہسپانوی امریکیوں کے لیے حقیقی حال ہمارے اپنے ملکوں میں نہیں تھا، یہ دوسروں کا گزارا ہوا وقت تھا؛ انگریزوں کا، فرانسیسیوں اور جرمنوں کا۔ یہ نیویارک کا، پیرس کا لندن کا وقت تھا۔ میں نے نظم لکھنی شروع کی، مجھے خبر نہیں کس نے مجھے لکھنے پر اکسایا۔ مجھے ایک اندرونی ضرورت نے اکسایا تھا جس کی تعریف میرے لیے مشکل ہے۔ صرف اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ حال سے میرے اخراج اور شعر لکھنے کے درمیان ایک خفیہ رشتہ تھا۔ شاعری وقتِ موجود سے محبت کرتی ہے اور اس کو نظم میں دوبارہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے، اس طرح اس کو تسلسل وقت سے علاحدہ کر کے ایک جامد حال میں تبدیل کرنا چاہتی ہے۔ مگر اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ میں یوں لکھتا ہوں، میں لکھتا رہا۔ میں حال میں داخل ہونے کی گزر گاہ کی تلاش میں تھا۔ میں نے اپنے قوت اور اپنی صدی کا ہونا چاہا۔ کچھ عرصے بعد یہ آسیب ایک جامد خیال بن گیا، میں نے ایک جدید شاعر بننا چاہا، جدت کا آغاز ہو چکا تھا۔"[۱۹]

پاز کے اقتباس میں تین باتیں توجہ طلب ہیں اول یہ کہ ہسپانوی امریکیوں (اور تیسری دنیا کے دیگر ملک جو نو آبادی رہ چکے ہیں) کا لمحہ موجود یا حال ہمارے اپنے ملکوں میں نہیں ہوتا، اس پر بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی "غیر" کا اجارہ ہے، نو آبادیات کے خاتمے کے بعد بھی یہ اثرات مقامیت کے لیے سوال بنے رہتے ہیں۔ دوم لمحہ موجود سے بے دخلی اور تخلیق میں کوئی رشتہ ضرور ہے۔ جی ہاں بالکل رشتہ موجود ہے بلکہ دونوں جزو لاینفک ہیں یہ بے دخلی یا Displacement ہی ہے جو تخلیق کے لیے ماحول پیدا کرتی اور تمام تخلیقی کاموں کی قوتِ

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

محرکہ ہے۔ سوم نظم لکھنے یا تحریر کے ذریعے نو آبادیات اور تخلیق کے رشتے کو سمجھنا اور ذات کو لاحق عفریتوں کا مقابلہ کرنا۔ ہم پاز کے آخری نکتے کی جانب پلٹے ہیں کہ انھوں نے جدید شاعر بننا چاہا مگر جدیدیت کیا ہے؟

جدیدیت کی اصطلاح کو عام طور پر ہم عصریت، معاصریت یا روشن خیالی کے معنوں میں برتا جاتا ہے تاہم مشہور فرانسیسی شاعر چارلس بودلیئر (Charles Baudelaire) نے اسے موضوعی تجربے کے بیان کے لیے مخصوص کیا تاہم لاطینی امریکیوں کے لیے جدید کا عمومی مطلب نو آبادیاتی جدیدیت ہے جو مخصوص مقاصد کی خاطر خطے کی زبان، کلچر، تاریخ اور ادب کی تشکیلِ نو ہی نہیں حقائق کو مسخ کرنا بھی ہے جسے زیادہ سے زیادہ "یورپیانے" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ پاز اس نو آبادیاتی جدیدیت کی نفی ہی نہیں کرتے اس کے اثرات پر گرفت بھی کرتے ہیں ان کے نزدیک جدیدیت اپنے وسیع معنوں میں بھی کوئی دبستان یا School of Thought نہیں بلکہ طرز فکر ہے جو سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ وقت کی مستقیمی حرکت (Linear Motion of Time) کے تسلسل میں عوامی ناگواری، تنہائی، مذہب اور سیاست پر تنقید، جنسی گھٹن اور قدامت پسندی کو نشانہ بناتی ہے تاہم اس کے اپنے مسائل ہیں۔ یہ فرد کو مرکز بناتے ہوئے ترقی کی اس منزل کو پہنچتی ہے جس کے ڈانڈے ماحول اور انسانی کی تباہی سے جا ملتے ہیں، گذشتہ صدی کی دو بڑی جنگیں ہوں یا پانچ براعظموں کو محیط نو آبادیاتی نظام اور مہلک ہتھیاروں کا کاروبار بہ ہر صورت وہی انسان اس کے نشانے پر ہے جسے یہ اپنی اصل میں مرکزیت دیتی ہے۔ پاز کی باتوں سے اختلاف ممکن نہیں البتہ ان کے ہاں Modernity اور Modernism میں فرق نہیں کیا گیا۔ البتہ وہ اس بات کا احساس رکھتے ہیں کہ دور حاضر نے ماضی کی بہت ساری اقدا کو بدل دیا یا منسوخ کر دیا ہے اپنی صدی میں جینے کا مطلب ان تبدیلیوں کو قبول کرنا اور زندگی کا حصہ بنانا ہے۔ تبدیلی بہ ہر حال زندگی کی علامت ہے اس کی نوعیت فوریت اور انقلاب کی ہو یا کسی ارتقائی عمل کا تسلسل ہو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وقت نے بڑے بڑے نظریات (Grand Narratives) کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جسے وہ نظریات کے زوال سے تعبیر کرتے ہیں جس کی بہتر تفہیم Post Modernism کے فلسفے میں ہوتی ہے۔ پاز شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے قدیم ورثے کی طرف رجوع کرتے ہیں، ویسے بھی ایک پس نو آبادیاتی مصنف یا شاعر سے اس کے علاوہ کیا توقع کی جاتی ہے کہ جلد یا بدیر اپنی اصل کی طرف رجوع کرے گا کہیں جوابی بیانیے تو کہیں متبادل بیانیے کی صورت میں اس کی مرجعت منطقی ہے۔ بقول پاز:

> "میں خود جدیدیت کے اس مقدس سفر میں راستہ تلاش کرنے کی کوشش میں بہت سے مقامات پر راستہ بھول گیا۔ میں منبعے کی طرف واپس ہوا اور دریافت کیا کہ جدیدیت باہر نہیں مگر ہمارے اندر ہے۔ یہ امروز ہے اور سب سے پرانی قدامت، یہ فردا ہے اور دنیا کی ابتداء، یہ ایک ہزار برس پرانی ہے مگر نوزائیدہ۔۔۔ یہ سالم و ثابت امروز، حال ہی میں کھود کر نکالا گیا صدیوں کی گرد جھاڑتا ہے، مسکراتا ہے اور کھڑکی سے باہر اچانک پرواز شروع کر دیتا ہے۔ وقت اور موجودگی کی بیک وقت کثرت: جدیدیت ماضی قریب سے ناتا توڑتی ہے تاکہ برسوں پرانے ماضی کی بازیافت کر سکے اور پتھر کے دور کی ایک مختصر سی ذرخیزی کو ہمارے عصر میں تبدیل کر سکے۔"(۲۰)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

اس سے قطع نظر حال کا شعور اور ماضی کی بازیافت جدیدیت نہیں مابعد جدیدیت کے عناصر ہیں پاز کا بار بار اپنے ماضی کی طرف رجوع کرنا اور ہسپانویوں اور ان سے قبل کے سارے ورثے کو قبول کرنا ہے اہم ہے۔

پابلو نیرودا اپنی تقریر کا آغاز ایک رومانی اور جاں گداز سفر کے بیان سے کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے ملک اور لاطینی امریکا کے ان خطوں کی طرف کیا جس کا ارادہ اچھا بھلا دل جگر اچاہتا ہے بڑے بڑے پیڑوں پر مشتمل وسیع و عریض جنگلوں، برف اور سبزے سے ڈھکی بلند و بالا چوٹیوں، سنسان اور برف زار پنہائیوں، ناختم ہونے والے میدانوں اور جان لیوا دریاوں کو یہ سفر ایک لاطینی امریکی شاعر کے لیے بیک وقت ذاتی اور لاطینی امریکی دریافت کا سبب بنا، اسی سفر میں اس نے موت کا نہایت قریب سے مشاہدہ کیا، پشتِ فرس پر میلوں کا سفر ہر لمحے امید اور مایوسی کی گود میں کیا تو کہیں اپنے ہی براعظم کے ان لوگوں کے ساتھ کھوپڑی کے گرد رقص کیا کہ تھکن تک اتر گئی، یہ سفر ہر حوالے سے شاعر کی تشکیلِ نو تھی، اس سفر نے اسے اپنے لوگوں کو قریب اور ان کے نقطہ نظر سے سمجھنے کو حوصلہ دیا یہ سفر شاعری کی دریافت کا سفر تھا۔ نیرودا بیان کرتے ہیں اس سفر نے انھیں زمین اور روح سے روشناس کیا جس کی زیریں تہہ میں شاعری جنم لیتی ہے۔ تنہائی اور جذبات شناسی ہی ایسے عوامل ہیں جو کسی تخلیقی انسان میں شاعری کی چھپی چنگاری کو بھڑکانے کا سبب بنتے ہیں، نیرودا نے اسی تنہائی میں اپنی شعری صلاحیت اور اپنے لوگ جو آگے چل کر اس کی شاعری کا موضوع بننے والے تھے کو دریافت کیا۔ حقیقت اور خواب کی اس درمیانی سرحد کی دریافت کو پابلو نیرودا نہ تو سراسر باہر سے مسلط کردہ حقیقت قرار دیتے ہیں نہ باطن کے کسی گمشدہ حصے کی بازیافت جو بیرون سے بالکل لاتعلق اور منقطع ہو بلکہ یہ دریافت درون و بیرون دونوں کے امتزاج سے عبارت ہے۔

نیرودا اسے ذاتی تجربہ، لوگوں کے تقاضے اور الزامات اور تخیل بیک وقت تینوں کی مشترکہ میراث مانتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں ایسی کوئی تنہائی نہیں جس پر قابو نہ پایا جا سکے، اصل میں تنہائی پر قابو پانا اظہار کی کسی نہ کسی صورت کی دریافت میں ہی ممکن ہے جس کے بعد انسان اس بنیادی سوال کا جواب تلاش کرتا ہے کہ ہم کون ہیں؟ یہ سوال کئی بار خود احتسابی کی صورت اختیار کرتا ہے تو کبھی کبھی اس کا مخاطب ذات سے باہر کوئی وجود، محرک اور صورت حال ہو سکتی ہے۔ یہ چاروں صورتیں تخلیق کار کو اس نادیدہ اور لامختتم سفر کا مسافر بنا دیتی ہیں جس کی واپسی کوئی نہ کوئی یادگار چھوڑتی ہے یہ یادگار نظم، گیت، کہانی یا آرٹ کوئی سا نمونہ ہو سکتی ہے۔

اپنی ذات میں جلاوطنی اور گھر واپسی کے اس سفر میں تخلیق کار کے لیے سب سے بڑا خطرہ اپنا دفاع اور دوسروں کو چھوٹا دکھانے کے لیے الزام تراشی ہے جو اسے راستے سے بھٹکا دیتی ہے، اپنا دفاع کرنا یا متعصب ہونا تخلیق کار میں بے اعتمادی کو جنم دیتا ہے جس اس کی تخلیقی صلاحیت کو مردہ کر دیتی ہے۔ نیرودا شاعر کے لیے نانبائی کی تمثیل استعمال کرتے ہیں جو آٹا گوندھنے، روٹیاں بنانے اور اور تنور میں پکنے کے لیے لگانے اور تیار ہو کر فراہم کرنے کے عمل میں کسی فخر کا اظہار نہیں کرتا شاعر کا کام اس سے مختلف نہیں، شاعری کا عمل ایک ہی وقت میں خدائی اختیار اور لاپرائی سے عبارت ہے جس میں ذاتی دفاع اور تعصب وقت کے ضیاع سے زیادہ کچھ نہیں۔ نیرودا شاعر کے منصب کی وضاحت کے بعد اپنے اصل سوال کی طرف پلٹتے ہیں کہ ہم کون ہیں؟ وہ لکھتے ہیں: ہمیں ایک گونگے براعظم کے دور دراز علاقوں کو الفاظ سے بھرنا ہو گا جب کہ ہم قصے کہانیاں گھڑنے اور نام رکھنے کے نشے میں رہتے ہیں۔ شاید میرے معاملے میں بات فیصلہ کن ہے، اور اگر ایسا ہے تو باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی میری عادت اور میری لاف زنی کچھ نہیں سوائے اس کے کہ یہ ایک عام امریکی

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

باشندے کا روزمرہ کا طریقہ ہے۔ میری نظموں کے ہر ایک ٹکڑے نے کسی ایک مرعی شے کی طرح اپنی جگہ پر ثبت ہونے کا فیصلہ کیا ہے، میری ہر ایک نظم نے کام میں آنے والا پرزہ بننے کا دعویٰ کیا ہے، میرے ہر گیت نے چوراہوں پر راہ نمائی کا نشان بن کر مسافروں کی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے، یا ایسا پتھر یا لکڑی کو ٹکڑا بننے کی کوشش کی ہے جس پر کوئی یا بعد میں آنے والا کوئی، نئے نشان کندہ کر سکے۔(۲۱)

نیرودا نے بہت ساری باتوں سے نقاب کشائی کر دی، ایک لاطینی امریکی شاعر اپنے صدیوں تک گونگے رکھے جانے والے براعظم کو زبان دینے اور اپنے لوگوں کے مسائل کو دنیا کے سامنے رکھنے اور ان کا حل دریافت کرنے کے لیے اپنی شاعری کو ذریعہ بناتا ہے، نظم کا مرئی شے کی طرح جگہ لینا، پرزہ بننا یا کم از کم کتبہ بننا جس پر موجود اور آنے والی نسلیں اپنا مدعا تحریر کر سکیں، سماجی تبدیلی کے اس عمل میں حصہ لینا ہے جو قوموں اور معاشروں کی ضمانت ہے۔ نیرودا سماجی تبدیلی کے اس سفر میں اپنے لوگوں کے ساتھ اور طاقت کے ان مراکز کے خلاف ہیں جن کی بقا عوام کو خاموش، بے بس اور حاشیہ نشین رکھنے میں مضمر ہے۔ نیرودا اپنے خطے کا نو آبادیاتی تجربہ ہو یا اس کے تسلسل میں قائم ہونے والی غیر جمہوری طاقتیں کسی سے غافل نہیں اور جانتے ہیں کہ ہماری بقا اسی مزاحمت اور طاقت کے خلاف جدوجہد میں ہے۔ وہ بظاہر خود سے مگر حقیقتاً دنیا بھر کے تخلیق کاروں سے ایک سوال کرتے ہیں کہ جدوجہد کے اس سفر میں اگر میں نے اپنے لوگوں کے حق میں طاقت کے مراکز کے خلاف مزاحمت نہ کی ہوتی تو آج یہ انعام حاصل کرنے کے لیے سر اٹھا کر کھڑا ہوتا؟ یہ دنیا بھر کے تخلیق کاروں کے ضمیر پر تازیانہ ہے کہ جب آپ اپنے خطے اور لوگوں کے ساتھ وفادار ہوتے ہیں تو نہ صرف شہرت اور ناموری آپ کو تلاش کر لیتی ہے بلکہ سر اٹھا کر بات بھی کرتے ہیں۔ نیرودا لاطینی امریکا کی اس جدوجہد کے بارے میں پر یقین ہیں کہ یہ رائیگاں نہیں جائے گی، کیوں کہ جیسے تنہا امید کوئی شے نہیں ایسے ہی تنہا جدوجہد بھی معنی نہیں رکھتی یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کی طاقت بنتی ہیں اور ہم لاطینی امریکی جدوجہد کے اس سفر میں پر امید ہیں کہ یہ ضرور رنگ لائے گی۔ سماجی تبدیلی کے سفر اور فن کار کے کردار کی تائید گیبریلا مسترال نے جسم اور روح(۲۲) کے لاینفک رشتے سے کی ہے کہ فن کار یا تخلیق کار بہ ہر حال اور بہ ہر صورت مزاحمت کے اس سفر میں اپنے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

(۲)

لاطینی امریکی نوبیل لاریٹس اپنی نوبیل پرائز تقاریر میں جس اہم مسئلے کو موضوع بناتے ہیں وہ لاطینی امریکی خطے کے باسیوں کے مسائل، ان مسائل کے حل میں فن کار یا تخلیق کار کا کردار اور نو آبادیاتی نظام کے خلاف مزاحمت ہے جو گیبریلا مسترال سے ماریو برگس یوسا تک سب میں مشترک ہے۔ یہ مصنفین اور شعراء کہیں بھی اپنے مسائل سے چشم پوشی کرتے نظر نہیں آتے جس کے باعث یہ اپنے خطے کے مسائل پر طلسمی، طلسماتی یا Magical ہونے کا لیبل قبول نہیں کرتے۔ دوسرا پہلو لاطینی امریکا اور اس کے باسیوں کی شناخت ہے جو نہ تو مکمل طور پر یورپی ہیں نہ امریکی بلکہ ان کی شناخت ان دونوں شناختوں کی آمیزش سے ترتیب پاتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ نو آبادیات یا کسی نوع کی فتوح کا تجربہ رکھنے والی نسلوں کا دو تہذیبوں کے ٹکراو، اثر پذیری اور اتصال کے بعد اس نوع کی صورتِ حال کا سامنا کرنا کوئی نئی بات نہیں تاہم مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب دو شناختیں آپس میں ٹکراو کا شکار ہوں یا ایک کی بقا لازماً دوسری کی بے دخلی

سے مشروط کر دی جائے تب یہی شناختیں نہ صرف اچھی بھلی الجھن کا سبب بنتی ہیں بلکہ تشدد[۲۳] کو بھی راہ ملتی ہے۔ پوسٹ نائن الیون دنیا میں مختلف تہذیبوں کے تصادم[۲۴] کی بحث نے خاصی توجہ حاصل کی ہے جس پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنا بہت بڑے خطرے کو جنم دے سکتا ہے۔ شناخت کا معاملہ کافی پیچیدہ ہے تاہم یہ واحد یا اکہری نہیں ہوتی بلکہ ایک فرد ایک ہی وقت میں متعدد شناختوں کا حامل ہو سکتا ہے جس کا حسین امتزاج لاطینی امریکی ادیب ہیں جو امریکی یا ریڈ انڈینز (مقامی) کی وہ نسل ہیں، جن کی رگوں میں یورپی یا ہسپانوی (نو آبادکار) خون دوڑتا ہے، دوسرے لفظوں میں جتنے پورپی ہیں اتنے ہی امریکی ہیں۔ یہ دوغلی یا Hybrid نسل ہیں جو یورپی اور مقامی میں تضاد نہیں دیکھتی، یہ نجیب محفوظ کی طرح دو تہذیبوں کے فرزند ۲۵ ہیں جو بیک وقت فرعون کی سچائی کی جستجو اور مسلمانوں کے علمی و فلسفیانہ سرمائے سے محبت کے امین ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ چلی سے تعلق رکھنے والی Lucila Godoy Alcoyoga جس نے فرانسیسی شاعر Frederic Mistral اور اٹلی کے مصنف Gabriele d Annunzio سے متاثر ہو کر Gabriela Mistral کا قلمی نام اختیار کرنے والی شاعرہ، ۷۔ اپریل ۱۸۸۹ میں پیدا ہوئیں لاطینی امریکا کی پہلی ادیبہ ہیں جنھیں ۱۹۴۵ میں نوبیل انعام سے نوازا گیا۔ خاندانی طور پر باسک اور ہندوستان کی مخلوق نسل سے متعلق اور بہ لحاظ پیشہ مدرس تھیں، مسترال کی شہرت ادب اور زندگی سے متعلق ان کے موقف اور غنائی شاعرہ کی ہے جس کو سب سے بڑا موضوع زندگی کی تلخی اور موت ہے، مسترال نے تین درجن کے قریب شعری مجموعے چھورتے ہوئے ۱۰۔ جون ۱۹۵۷ میں انتقال کیا۔ گوئٹے مالا کے Maguel Angel Austurias (۱۹۔ اکتوبر ۱۸۹۹-۹۔ جون ۱۹۷۴) دوسرے ادیب اور ناول نگار ہیں جنھیں ۱۹۶۷ میں یہ انعام دیا گیا ان کی نوبیل پرائز تقریر کا عنوان 'لاطینی امریکی ناول: ایک عہد کی گواہی ہے۔ لاطینی امریکا سے متعلق تیسرے شاعر Ricardo Eliecer Neftali Royes Basoalto جنھوں نے ایک چیک شاعر Jan Neruda سے متاثر ہو کر Pablo Neruda کا قلمی نام اختیار، کیا کا تعلق بھی چلی سے ہے۔ پابلو نیرودا (۱۲۔ جولائی ۱۹۰۴-۲۳۔ ستمبر ۱۹۷۳) کی شہرت سینیٹر، سفیر اور شاعر کی ہے جس نے انسان اور زمین کے مابین ہم آہنگی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور چالیس کے قریب شعری مجموعے ورثے میں چھوڑے ۱۹۷۱ میں نوبیل انعام حاصل کیا اور تقریر کا عنوان 'اک شہر دل فریب ہے'۔ ۱۹۸۲ میں نوبیل انعام حاصل کرنے والے کولمبین ناول نگار اور صحافی Gabriel Garcia Marquez ۶۔ مارچ ۱۹۲۷ کو پیدا ہوئے (اور ۱۷۔ اپریل ۲۰۱۴ کو انتقال کیا) کی شہرت نانی اور خالاوں سے کہانی سن کر بیان کرنے والے ادیب کی ہے جو اردو کے افسانہ و ناول نگار انتظار حسین سے خاصی مشترک ہے، مارکیز نے 'لاطینی امریکا کی تنہائی' کے عنوان سے تقریر کی۔ پانچواں پرائز میکسیکو کے سفیر اور شاعر Octavio Paz کو ۱۹۹۰ میں دیا گیا جو ۳۱۔ مارچ ۱۹۱۴ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۔ اپریل ۱۹۹۸ کو انتقال کیا ان کی تقریر کا عنوان 'موجود کی تلاش' ہے۔ ادب کا آخری نوبیل پرائز ۲۰۱۰ میں پیرو کے ناول گار Gorge Mario Pedro Vargas Llosa جو ماریو برگس یوسا (پیدائش: ۲۸۔ مارچ ۱۹۳۶) کے نام سے جانے جاتے ہیں کو دیا گیا جو لاطینی امریکی بوم سے تعلق رکھنے والوں میں آخری بقید حیات ادیب ہیں ان کی تقریر کا عنوان 'مطالعہ اور فکشن کی مداح میں' ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

۲۔ آستوریاس، میگل اینجل، نوبیل ادبیات، مترجم: باقر نقوی، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۱۰، ص ۴۲۶

۳۔ آستوریاس، میگل اینجل، نوبیل ادبیات، ص ۴۲۱

۴۔ ایضاً، ص ۴۲۶، ۴۲۷

۵۔ مارکیز، گابرئیل گارسیا، منتخب تحریریں، آج، کراچی، ۲۰۱۱، ص ۵۲۵

۶۔ سوزن بیسنیٹ، تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵، ص ۱۳۷

۷۔ مارکیز، گابرئیل گارسیا، منتخب تحریریں، آج، کراچی، ۲۰۱۱، ص ۵۲۸

۸۔ مارکیز، گابرئیل گارسیا، منتخب تحریریں، ص ۵۲۹

۹۔ ایضاً، ص ۵۳۰

۱۰۔ ارندھتی رائے، تخئیل کی موت، مترجم: اجمل کمال، آج، کراچی، ۲۰۲۱، ص ۳۴

۱۱۔ یوسا، ماریو برگس، انٹرویو، مشمولہ، فنِ فکشن نگاری، مترجم: محمد عمر میمن، دانیال، کراچی، ۲۰۱۶، ص ۶۷

۱۲۔ یوسا، ماریو برگس، نوبیل خطبات (ادب)، مترجم: یاسر جواد، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۸، ص ۱۱۵

۱۳۔ یوسا، ماریو برگس، نوبیل خطبات، ص ۱۱۶

۱۴۔ برٹرینڈ رسل، فلسفہء مغرب کی تاریخ، مترجم: پروفیسر محمد بشیر، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۹، ص ۱۵۴

۱۵۔ یوسا، ماریو برگس، نوبیل خطبات (ادب)، مترجم: یاسر جواد، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۸، ص ۱۲۶

۱۶۔ یوسا، ماریو برگس، نوبیل خطبات، ص ۱۲۲، ۱۲۱

۱۷۔ اوکتاویو پاز، نوبیل ادبیات، مترجم: باقر نقوی، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۱۰، ص ۱۶۵

۱۸۔ اوکتاویو پاز، نوبیل ادبیات، ص ۱۶۸

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۶۸

۲۰۔ ایضاً، ۱۷۴

۲۱۔ پابلو نیرودا، نوبیل ادبیات، مترجم: باقر نقوی، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۱۰، ص ۳۷۸

۲۲۔ گیبریلا مسترال، نوبیل ادبیات، مترجم: باقر نقوی، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۱۰، ص ۵۷۷

۲۳۔ امرتیا سین، تشخص اور تشدد، مترجم: پروفیسر مقبول الٰہی، مشعل بکس، لاہور، ۲۰۰۹، ص ۸

۲۴۔ سیمویل پی ہنٹنگٹن کی تصنیف The Clash of Civilization and the Remaking of World Order کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

۲۵۔ نجیب محفوظ، نوبیل ادبیات، مترجم: باقر نقوی، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۱۰، ص ۱۹۳

References in Roman Script:

1. chali se talluq rakhnay wali Lucila Godoy Alcoyoga jis ne francesi shayar Frederic Mistral or italy ke musannif Gabriele d Annunzio sai mutasir ho kar Gabriela Mistral ka qalmi naam ikhtiyar karne wali shaeirah, 7. April 1889 mein peda huien lateeni America ki pehli Adiba hain jinhen 1945 mein nobel inaam se nawaza gaya. khandani tor par Basik aur hindostan ki makhlooq nasal se mutaliq aur bah lehaaz pesha mudarris theen ,Mistral ki shohrat adab aur zindagi se mutaliq un ke muaqqaf aur ganai shaeirah ki hai jis ko sab se bara mauzo zindagi ki talkhi aur mout hai ,Mistral ne teen darjan ke qareeb sheri majmoay chhorte hue 10. June 1957 mein intqaal kya. goyte malaa ke maguel angel austurias (19. october 1899-9. June 1974) dosray Adeeb aur novel nigaar hain jinhen 1967 mein yeh inaam diya gaya un ki nobil prize taqreer ka unwan' lateeni Amrici novel : aik ehad ki gawahi hai. lateeni America se mutaliq teesray shayar ricardo eliecer neftali royes basoalto jinhon ne aik check shayar jan neruda sy mutasir ho kar pablo Neruda ka qalmi naam ikhtiyar, kya ka talluq bhi chali se hai. pablo niroda (12. July 1904-23. September 1973) ki shohrat senetor, safeer aur shayar ki hai jis ne insaan aur zameen ke mabain hum ahangi ko apni shairi ka mauzo banaya aur chalees ke qareeb sheri majmoay virsay mein chhorey 1971 mein nobil inaam haasil kya or takreer ka unwan' ik shehar dil fraib hai ‘ 1982 mein nobil inaam haasil karne walay colmbine novel nigaar aur sahafi gabriel garcia marquez 6. March 1927 ko peda hue (17. April 2014 ko intqaal kya) ki shohrat nani aur khalalun se kahani sun kar bayan karne walay Adeeb ki hai jo urdu ke afsana o novel nigaar intzaar Hussain se khasi mushtarik hai ,Markeez ne' lateeni America ki tanhai' ke unwan se taqreer ki. panchawan prize mexico ke safeer aur shayar octavio paz ko 1990 mein diya gaya jo 31. March 1914 mein peda hue aur 19. April 1998 ko intqaal kya un ki taqreer ka unwan' mojood ki talaash' hai. adab ka aakhri nobil prize 2010 mein pairo ke novel gaar gorge mario pedro vargas Llosa jo mario brgs yosa (paidaiesh : 28. March 1936) ke naam se jane jatay hain ko diya gaya jo lateeni Amrici boom se talluq rakhnay walon mein aakhri baqeed hayaat Adeeb hain un ki taqreer ka unwan' mutalea aur fiction ki madah mein' hai.
2. Asturias, Miguel Angel, Nobel Adbiyat Mutrjm:Baqir Naqvi, Acadmi Bazyaft, Karachi, 2010, P. 426
3. Asturias, Miguel Angel, Nobel Adbiyat, P. 421
4. Ibid, P. 426, 427
5. Marquez, Gabrial Garcia, Montakhab Tehreren, Aaj, Karachi, 2011, P. 525
6. Susan Bassnett, Taqabli Adab: Ayk Tanqidi Motala, Mutrjm:Touhid Ahmad, Poorab Academy, Islamabad, 2015, P. 137
7. Marquez, Gabrial Garcia, Montakhab Tehreren, Aaj, Karachi, 2011, P. 528
8. Marquez, Gabrial Garcia, Montakhab Tehreren, P. 529
9. Ibid, P. 530
10. Arundhati Roy, Takhayal ki Maot, Mutrjm:Ajmal Kamal, Aaj, Karachi, 2021, P. 34
11. Llosa, Mario Vargas, Interview, Mashmoola: Fan e Fiction Nigari, Mutrjm: Muhammd Umar Memon, Danial, Karachi, 2016, P. 67

12. Llosa, Mario Vargas, Nobel Khutbat, Mutrjm:Yasir Jawwad, Urdu Science Board, Lahore, 2018, P. 115
13. Llosa, Mario Vargas, Nobel Khutbat, P. 116
14. Bertrand Russel, Falsafa e Maghrib ki Tareekh, Mutrjm: Muhammad Bashir, Poorab Academy, Islamabad, 2019, P. 154
15. Llosa, Mario Vargas, Nobel Khutbat, Mutrjm:Yasir Jawwad, Urdu Science Board, Lahore, 2018, P. 126
16. Llosa, Mario Vargas, Nobel Khutbat, P. 121, 122
17. Octavio Paz, Nobel Adbiyat, Mutrjm:Baqir Naqvi, Acadmi Bazyaft, Karachi, 2010, P. 165
18. Octavio Paz, Nobel Adbiyat, P. 168
19. Ibid, P. 168
20. Ibid, P. 174
21. Pablo Neruda, Nobel Adbiyat, Mutrjm:Baqir Naqvi, Acadmi Bazyaft, Karachi, 2010, P. 378
22. Gabriela Mistral, Nobel Adbiyat, Mutrjm:Baqir Naqvi, Acadmi Bazyaft, Karachi, 2010, P. 677
23. Amertya Sen, Tashakhus aor Tashaddud, Mutrjm:Prof. Maqbool Elahi, Mashal Books, Lahore, 2009, P. 8
24. Smuel P. Huntington, Clash Of Civilization
25. Naguib Mahfouz, Nobel Adbiyat, Mutrjm:Baqir Naqvi, Acadmi Bazyaft, Karachi, 2010, P.193

Mr. Qamar Abbas Alvi received the M. Phil degree in Urdu. He is currently pursuing the Ph.D. degree and serving as a lecturer at the Department of Urdu, University of Jhang, Pakistan. He has authored over 18 publications in different journals and conferences. His current research interests include Urdu criticism and translations of world literature.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

انڈیکس

مقالہ نگار	عنوان	صفحات نمبر	ملخص	کلیدی الفاظ
پروفیسر کونگ جُولان	چینی ادیب رؤشی کے افسانے "بیوی کی عارضی فروخت" اور احمد ندیم قاسمی کے افسانے "بیٹے بیٹیاں" کا تقابلی مطالعہ	۱ - ۹	اس مقالے میں چینی ادیب رؤشی کے افسانے "بیوی کی عارضی فروخت" اور احمد ندیم قاسمی کے افسانے "بیٹے بیٹیاں" کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ جس کا مقصد دونوں مصنفین کے یکساں خیالات کو اجاگر کرنا ہے جو سماجی، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر مختلف ہونے کے باوجود ایک سا ہے۔ دونوں اپنے عہد کی عورت کو درپیش مسائل اور طبقاتی استحصال کی عمدہ مثالیں ہیں۔ دونوں ممالک کی خواتین جن محرومیوں اور سماجی عدم استحکام کی زندگی گزار رہیں ہیں یا مصنفین کے عہد میں گزار رہیں تھیں اس صورت حال کو دونوں افسانہ نگاروں نے کس طرح اپنے مشاہدے کی باریک بینی سے کہانی کے روپ میں ڈھالا ہے اس کا تقابل اور جائزہ اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے۔ جس سے قارئین نہ صرف دو مختلف معاشروں میں بسنے والی عورت کے سماجی مسائل سے آگاہ ہوتے ہیں بلکہ خواتین کی مشترکہ جدوجہد کے بارے میں بھی یہ مقالہ پُرجوش بصیرت فراہم کرنے، معاشرتی ناہمواریوں کو بے نقاب کرنے اور ان پر تنقید کرنے میں ادب کے کردار کو اجاگر کرتا ہے۔	طبقاتی، استحصال، تہذیبی، سماجی، خواتین، مسائل، محرومیوں، امتیازات۔
ڈاکٹر علی بیات / عامر بشیر	ڈاکٹر عمران ظفر کی مزاحیہ شاعری میں سماجی رویوں پر طنز	۱۰ - ۲۶	دورِ حاضر میں معاشی اور خانگی مسائل کی وجہ سے انسان جس ذہنی دباؤ کا شکار ہے اس دباؤ کو کم کرنے اور اس صورت حال کو اجاگر کرنے میں ڈاکٹر عمران ظفر کی مزاحیہ شاعری اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مقالہ ہذا میں ڈاکٹر عمران ظفر کی شاعری میں سماجی رویوں پر کیے گئے طنز کو بیان کیا گیا ہے۔ اُن کی کتابیں "کرونا مرے آگے" اور "شعر آیا شعر آیا" مزاحیہ ادب کا شاہکار ہیں۔ وہ جب زندگی کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کرتے ہیں تو اُن کی حسِ مزاح قاری پر اپنا بھرپور اثر چھوڑتی ہے۔ اس مقالے میں نہ صرف ان کے اسلوب پر گفتگو کی گئی ہے بلکہ اس انداز کو بھی نمایاں کیا گیا ہے جس میں انھوں نے زندگی کو مختلف پہلوؤں سے روشناس کروایا ہے اور نا پسندیدہ معاشرتی رویوں کو خوشگوار انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی مزاحیہ شاعری کا جائزہ لینے کے بعد معاشرتی رویوں پر طنز بھی ظاہر ہوتا ہے جو معاشرتی اصلاحات کا باعث بنتا ہے۔	مزاح، معاشرہ، کرونا، تحریف نگاری، پیروڈی، طنز، معاشرتی ناہمواری

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ڈاکٹر محمد یوسف / ڈاکٹر عنبرین خواجہ	آزاد کشمیر کی اردو شاعری پر ادبی شخصیات کے اثرات: ایک مطالعہ	۲۷ - ۴۶	یہ مقالہ آزاد کشمیر کی اردو شاعری پر ادبی شخصیات کے اثرات کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ انسانی شخصیت کئی طرح کے مراحل اور اثرات سے مل کر تشکیل پاتی ہے۔ آج کی دنیا میں ایک شخصیت پہ اپنے گھر سے لے کر پوری دنیا کے اثرات موجود ہوتے ہیں۔ آزاد کشمیر ایک ایسا خطہ ہے جہاں مختلف تہذیبوں اور مختلف شخصیات کے اثرات رہے ہیں۔ ادب میں بھی یہ اثرات بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ شاعری میں تو شعرا نے بڑی ادبی شخصیات کو کئی حوالوں سے برتا ہے ۔ کہیں تو ایک جیسی زمینوں کا استعمال کیا ہے، کہیں بحروں میں مماثلت دکھائی دے رہی ہے، کہیں فکر میں اشتراکیت اور کہیں فن میں ملا جلا رجحان ہے۔ مجموعی طور پر اس صورت حال کا مطالعہ اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے۔	شخصیت، اثرات، تشکیل، عناصر، شاعری، بحروں، اشتراکیت، کشمیر۔
طالب حُسین ہاشمی / ڈاکٹر سید شیراز علی زیدی	اقبالیات اور تصوف: بشیر احمد نحوی کی اقبالیاتی فِکر کا تجزیہ	۴۷ - ۵۷	اس مقالے میں مقبوضہ کشمیر کے ادبی تناظر میں بشیر احمد کی اقبالیاتی فکر "تصوف" پر بحث کی گئی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد نحوی کی مقبوضہ کشمیر میں زیادہ توجہ اقبال اور اقبالیات پر ہی مرکوز رہی اِسی لیے مقبوضہ جموں کشمیر میں اقبال شناس کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں اقبالیات کے حوالے سے حالات اتنے ساز گار نہ ہوتے ہوئے بھی ان کا اقبالیات کی طرف متوجہ ہونا اور مسلسل اس پر کام کرنا ظاہر کرتا ہے کہ انھیں اقبالیات سے ایک خاص قسم کی نسبت اور شغف ہے۔ بشیر نحوی نے تصوف کے حوالے سے فکرِ اقبال کو جس طور پر پیش کیا ہے اس کو مقالے کے ذریعے قارئین کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ اُردو ادب و صحافت اور دیگر علمی و ادبی کارناموں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے مقبوضہ کشمیر کے ادبی تناظر میں بشیر احمد نحوی کی اقبالیاتی فکر کی تحقیق و تنقید کے میدان میں معاون ہے۔	کشمیر، تصوف، اقبالیات، فکر، حالات، تصورات، وحدت الوجود، وحدت الشہود، مشرق رہبانیت۔
ڈاکٹر محمد سہیل اقبال / ڈاکٹر طاہرہ غفور	"ساسا" کے کرداروں پر میڈیائی پروپیگنڈا کے اثرات	۵۸ - ۶۴	اس مقالے میں شیراز دستی کے ناول "ساسا" کے کرداروں پر میڈیائی پروپیگنڈا کے اثرات کو پیش کیا گیا ہے۔ ساسا کا زمانی پس منظر اکیسویں صدی میں ہونے والا سانحہ ہے جو اُردو ناول میں نائن الیون (گیارہ ستمبر) کے نام سے مشہور ہوا ہے۔ اس دلخراش واقعے سے چند گھنٹوں میں عالمی سیاسی منظر نامہ تبدیل ہو گیا۔ نیویارک میں ٹاوروں کی مسماری کے اثرات نے مسلم دنیا کو متاثر کیا۔ امریکہ اور مغربی ممالک میں مقیم پاکستانی مسلمانوں نے اس واقعے کے اثرات کا براہ راست سامنا کیا ہے۔ اس ناول میں کرداروں کے ذریعے سانحے کے محرکات کو واضح کیا ہے اور سوالات کا بھی ایک سلسلہ قائم کیا ہے جو کرداروں کے عمل اور مکالمے کی صورت میں مرتب ہوا ہے۔ ان کرداروں میں "نائن الیون" سے متاثر ہونے والے کرداروں کے سیاسی، سماجی، اور	ساسا، کردار، سلیم، محبت، امریکہ، چینی، نائن الیون ، میڈیا، پروپیگنڈا۔

			معاشی مسائل کو مرکزیت حاصل ہے۔ جو مغربی اور یورپی میڈیا نے ان پر مسلط کر رکھے ہیں۔ یہ کردار اندورن اور بیرون ملک اپنے تشخص کی جو جنگ لڑ رہے ہیں ان کا مطالعہ اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے۔	
ثقلین احمد خان / محمد برہان حسن	ناسٹلجیا کے تناظر میں ناول "آگے سمندر ہے" کا مطالعہ	۶۵ - ۷۳	اس مقالے میں انتظار حسین کے ناول "آگے سمندر ہے" کا ناسٹلجیا کے تناظر میں مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ادبی اصطلاح میں ناسٹلجیا "ماضی کی یادیں" کہلاتی ہیں۔ یہ زندگی میں انسان کے لیے تحرک کا باعث بنتی ہیں۔ ادب میں اس حوالے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، جن ادبا نے برصغیر کی تقسیم کا براہِ راست تجربہ کیا انہوں نے یاد کو اپنی تحریروں میں اہم موضوع کے طور پر پیش کیا ہے ۔ ناول "آگے سمندر ہے" میں ناسٹلجیا کے گہرے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ خاص طور پر تقسیم اور اس سے جڑی یادوں کو اس ناول میں موضوع بنایا گیا ہے؛ کہ کیسے تقسیم سے گھر برباد ہوئے جن کی از سرِ نو تعمیر میں ایک عہد صرف ہو گیا۔ اپنے آباو اجداد کی سرزمین کو چھوڑنے میں کن ذہنی و جسمانی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان المیاتی عناصر کو سمجھنے میں یہ مقالے اہم کردار ادا کرتا ہے۔	ناسٹلجیا، یادِ ماضی، زندگی، تلخیاں، نفسیات، برصغیر، فرسودہ۔
الماس اکمل	"بہاؤ" کے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ	۷۴ - ۸۴	مستنصر حسین تاڑڑ اردو کے نامور ناول نگار ہیں۔ اس آرٹیکل میں تاڑر کے ناول بہاؤ میں پیش کی گئی ویران ہوتی بستی اور اس کی تہذیب کے انہدام کے باعث انسانی فکر اور نفسیات پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی شناخت اور ثقافت کے بقا کے تحفظ کے خاطر کرداروں میں نفسیاتی کشمکش کے باعث پیدا ہونے والی صورتحال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سگمنڈ فرائیڈ کی پیش کی گئی نفسیات کی تعریف کی روشنی میں کرداروں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ناول میں پیش کی گئی تاریخی معلومات زیر بحث لائی گئی ہے۔ ناول نگار کا منفرد لب و لہجہ اور زبان کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ ناول نگار کا کرداروں کو علامات کے ذریعے پیش کرنے کی تکنیک پر بحث کی گئی ہے۔ ناول کو تانیثی نقطہ نظر سے پرکھا گیا ہے۔ پانچ ہزار سال پرانے استحصالی نظام کا موجودہ دور کے جاگیردارانہ نظام سے موازنہ کرتے ہوئے ماحصل پیش کیے گئے ہیں۔	نفسیاتی، تہذیب، سگمنڈ فرائیڈ، تکنیک، کرداروں، تانیثی، تاریخی۔
ڈاکٹر رحمان سرور باجوہ	پی ایچ ڈی کی سطح پر پاکستانی جامعات میں آپ بیتی پر محررہ مقالات کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ	۸۵ - ۱۰۳	جامعات میں آپ بیتیوں پر تحقیق سے نہ صرف اس صنف کے عمومی تقاضے واضح ہوئے ہیں بلکہ اس صنف کی حدود و قیود کا تعین کرنا قدرے آسان ہوا ہے۔ جامعات میں ابتدائی طور پر تحقیقی کام آپ بیتیوں کا محض فکری و فنی جائزہ لینے کی حد تک ہی محدود تھا۔ ایک قاری آپ بیتی کی صنف میں دلچسپی صرف اس لیے نہیں لیتا کہ اسے آپ بیتی کی شخصیت سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے بلکہ اس کی دلچسپی اس آپ بیتی نگار کے عہد کے سیاسی و سماجی، ثقافتی و تہذیبی عناصر سے بھی ہوتی ہے۔ مقالے میں پاکستان کی جامعات میں ڈاکٹریٹ کی سطح پر	آپ بیتی، تحقیق، صنف، جامعات، مقالے، فکر و فن، تہذیبی، ثقافتی۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

			اردو آپ بیتی کے تحریر شدہ مقالوں کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے جو آپ بیتی کے فن اور روایت میں مزید بہتری کی راہیں ہموار کرنے میں معاون ہے۔	
قمر عباس علوی	لاطینی امریکی ادیبوں کے نوبیل خطبات میں متبادل شناخت کا کلامیہ	۱۰۴ – ۱۲۲	لاطینی امریکا کی اصطلاح امریکا کے ان ممالک کے مجموعے کے لیے استعمال ہوتی ہے جہاں لاطینی سے ماخوذ رومانی زبانیں (ہسپانوی، پرتگیزی اور فرانسیسی) بولی اور لکھی جاتی ہیں۔ یہ خطہ اپنی متنوع ثقافت، باثروت تاریخ، دل کش مناظر، خوب صورت پہاڑوں، برف زاروں اور سواحل کے لیے مشہور ہے۔ اس خطے سے تعلق رکھنے والے ادیبوں میں گیبریلا مسترال، میگیل اینجل آستوریاس، پابلو نیرودا، اوکتاویو پاز اور ماریو برگس یوسا کو نوبیل انعام مل چکا ہے ان ادیبوں نے اپنے اپنے ممالک کے مسائل کے علاوہ سماجی ناانصافی، مزاحمت اور سماجی تبدیلی کے لیے جدوجہد، قومی اور ذاتی شناخت، معاشی عدم مساوات اور انسانی حقوق کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ یہ مقالہ انہی ادیبوں کی نوبیل انعام یافتہ تقریروں کے خصوصی مطالعے پر محیط ہے۔	پرتگیزی، فرانسیسی، ہسپانوی، لاطینی، خطبے، تقریر، نبیل، انعام، شناخت، ادیبوں حقوق۔

CONTENTS

Editorial		
A Comparative Study of the Short stories by Chinese Writer Rou Shi "A Slave Mother" and Ahmed Nadeem Qasmi "Sons & Daughters"	Professor Kong Julan	1
Satire on Social Attitudes in Humorous Poetry of Dr. Imran Zafar	Dr. Ali Bayat/ Aamir Bashir	10
Influence of Literary Figures on Urdu Poetry of Azad Kashmir: A Study	Dr. Muhammad Yousaf/ Dr. Ambreen Khawja	27
Iqbaliyat and Sufism: An Analysis of Bashir Ahmed Nahvi's Iqbalistic Thought	Talib Hussain Hashmi/ Dr. Syed Shiraz Ali Zaidi	47
Influence of Media Propaganda on the Characters of "Sasa"	Dr. Muhammad Sohail Iqbal/ Dr. Tahira Ghafoor	58
A Study of the Novel "Aagy Samadar Hai" in the Perspective of Nostalgia	Saqlain Ahmad Khan/ Muhammad Burhan Hassan	65
A Psychological Study of the Characters of Novel "Bahao"	Almas Akmal	74
A Critical and Research Review of Written Thesis on Autobiography at PhD Level in Pakistani Universities	Dr. Rehman Sarwar Bajwa	85
Discourse of Alternative Identity in Nobel Prize Lectures of Latin American Writers	Qamar Abbas Alvi	104
Index		123

“Daryaft”

ISSN Online: 2616-6038

ISSN Print: 1814-2885

Research Journal of Urdu Language & Literature

Published by: National University of Modern Languages, Islamabad

Department of Urdu Language & Literature

Subscription / Order Form

Name: _____

Mailing Address: _____

_____

City Code: _____ Country: _____

Tel: _____ Fax: _____

Email: _____

Please send me _____ copy/ copies of The “Daryaft”

I enclose a receipt of Online Fund Transfer of Pkr/US$ _____ In Daryaft Account No: 0550380006660, Askari Bank I-9 Branch, Islamabad.

Signature: _____ Dated: _____

Note:
Price per Issue in Pakistan: Pkr 600 (including Postal Charges)
Price Per Issue other countries: US$ 5 (excluding Postal Charges)
Please return to: Department of Urdu Language & Literature,
NUML, H-9/4, Islamabad, Pakistan
Phone: 051-9265100-10, Ext: 2262

DARYAFT

Vol: 16, Issue: 01

January - June 2023

ISSN Online: 2616-6038

ISSN Print: 1814-2885

"DARYAFT" is a HEC Recognized Journal

It is included in Following National & International Databases:

1. DOAJ (Directory of Open Access Journals)
2. Crossref
3. MLA database (Directory of Periodicals & MLA Bibliography)
4. Index Urdu Journal (IIUI),
5. International Scientific Indexing (ISI)
6. Scientific Indexing Services (SIS)
7. Tehqeeqat, A Research Indexing System
8. EuroPub (Directory of Academic and Scientific Journals)

Department of Urdu Language and Literature,
National University of Modern Langauges, Islamabad

ADVISORY BOARD (INTERNATIONAL)

Prof. Dr. Heinz Werner Wessler
Department of Linguistics and Philology, Uppsala University, Uppsala, Sweden

Prof. Dr. Shahabuddin
Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh, India

Prof. Dr. Moinuddin A. Jinabade
Centre for Indian Languages, School of Language Literature and Cultural Studies, Jawaharlal Nehru University, New Delhi, India

Prof. Dr. Muhammad Mahfooz Ahmad
Head, Department of Urdu, Faculty of Humanities & Languages, Jamia Millia Islamia, New Delhi, India

Dr. Arzu Ciftsuren
Department of Urdu, University of Istanbul, Istanbul, Turkiye

ADVISORY BOARD (NATIONAL)

Prof. Dr. Khalid Mehmood Khattak
Chairperson, Department of Urdu, University of Balochistan, Quetta, Pakistan

Prof. Dr. Zia Ul Hassan
Institute of Urdu Language and Literature, Oriental College, University of Punjab, Lahore, Pakistan

Prof. Dr. Robina Shaheen
Head, Department of Urdu, University of Peshawar, Peshawar, Pakistan

Prof. Dr. Saima Irum
Chairperson, Department of Urdu, Government College University, Lahore, Pakistan

Prof. Dr. Sohail Abbas
Chairperson, Department of Urdu, Ghazi University, Dear Ghazi Khan, Pakistan

EDITORIAL BOARD (INTERNATIONAL)

Prof. Dr. Halil Toker
Head of Urdu Language and Literature Chair, Istanbul University, Istanbul, Turkiye

Prof. Dr. Khawaja Ikram ud Din
Department of Urdu, Jawaharlal Nehru University, New Delhi, India

Prof. Dr. Asuman Belen Ozcan
Head, Department of Urdu, University of Ankara, Ankara, Turkiye

Prof. Dr. Mehmoodul Islam
Department of Urdu, Faculty of Arts, Dhaka University, Dhaka, Bangladesh

Prof. Dr. Ibrahim Muhammad Ibrahim
Head, Department of Urdu, Faculty of Humanities, Al-Azhar University (Girls Campus) Madeent Nasr, Cairo, Egypt

EDITORIAL BOARD (NATIONAL)

Prof. Dr. Abdul Aziz Sahir
Dean, Faculty of Social Sciences and Humanities, Allama Iqbal Open University, Islamabad, Pakistan

Prof. Dr. Muhammad Kamran
Director of the Institute of Urdu Language and Literature, Oriental College, University of the Punjab, Lahore, Pakistan

Prof. Dr. Tanzeem-ul-Firdous
Head, Department of Urdu, University of Karachi, Karachi, Pakistan

Prof. Dr. Rubina Tareen
Department of Urdu, B.Z University, Multan, Pakistan

FOR CONTACT
Department of Urdu Language & Literature,
National University of Modern Languages, H-9, Islamabad
Telephone: 051-9265100-10, Ext: 2262
E-mail: daryaft@numl.edu.pk
Website (OJS): *https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft*

DARYAFT

Vol: 16, Issue: 01

January - June 2024

ISSN Online: 2616-6038
ISSN Print: 1814-2885

PATRON IN CHIEF
Maj. Gen. ® Shahid Mahmood Kayani HI (M) (Rector)

PATRON
Dr. M. Zubair Iqbal (Pro-Rector Research &Strategic initiatives Division)

CHIEF EDITOR
Prof. Dr. Jamil Asghar Jami (Dean Faculy of Languages)

EDITOR
Dr. Zafar Ahmed

CO-EDITOR
Dr. Abu Bakar Saddique Rathore

RESEARCH ASSISTANT
Ms. Sidra Tahir

NATIONAL UNIVERSITY OF MODERN LANGUAGES

ISLAMABAD

ISSN Online: 2616-6038
ISSN Print: 1814-2885

DARYAFT

Research Journal

Volume: 16, Issue: 01
Jan-June 2024

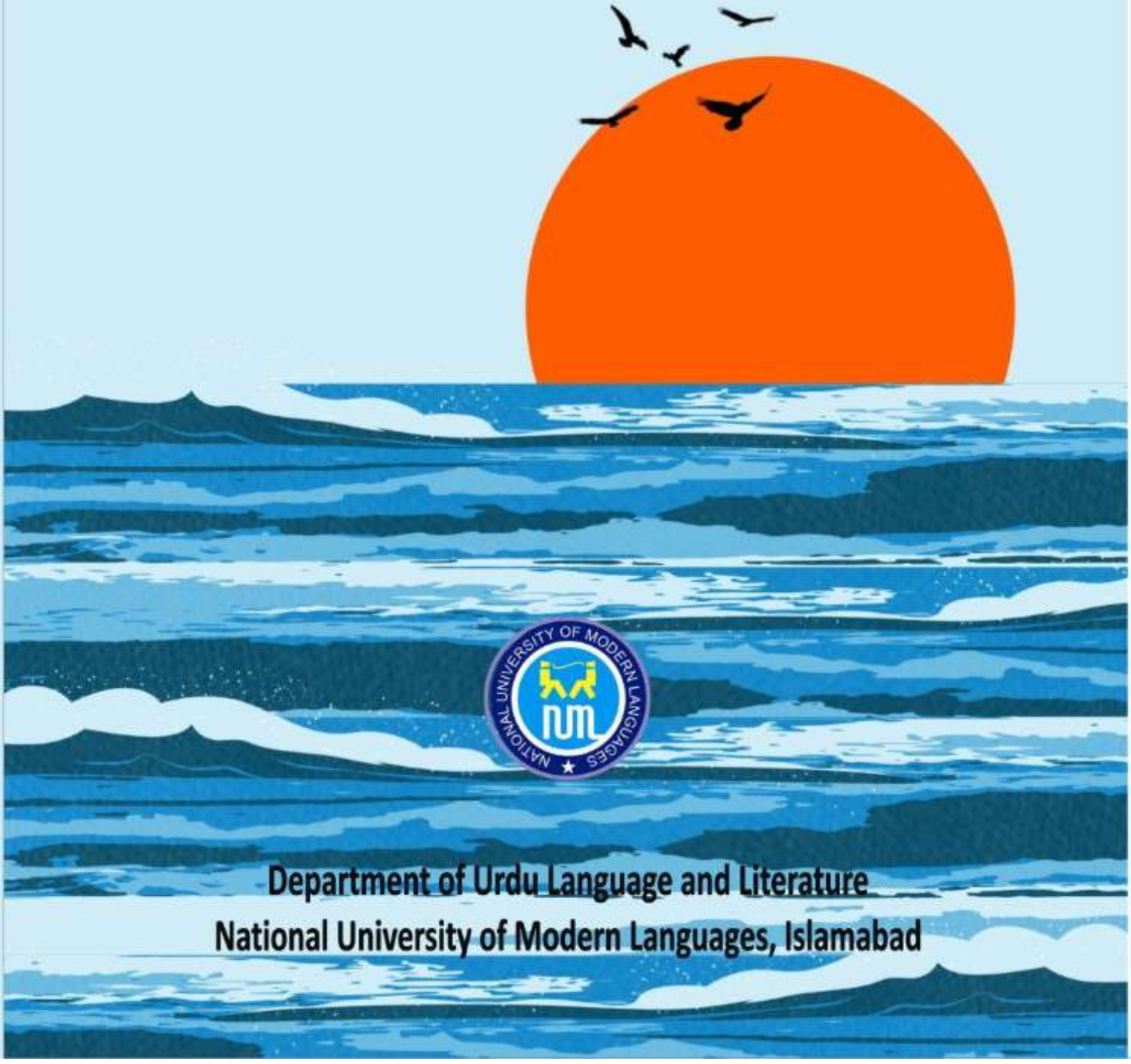

Department of Urdu Language and Literature
National University of Modern Languages, Islamabad